اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

اگست ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۸، اگست ۲۰۱۸ء / ذیقعدہ ۱۴۳۹ھ

# مشمولات

**○فکر و نظر**

غزالاں ہم نہ کہتے تھے [انتخابات ۲۰۱۸ء میں دینی جماعتوں کی شکست] ۴

**○تعلیم و تحقیق**

- اسلامی علوم میں دائرہ ہائے تحقیق (آخری قسط) — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۶
- ڈاکٹر محمد فواد سیزگین ۔ فی ذمۃ اللہ — ابن الحسن عباسی ۱۲

**○تعلیم و تربیت**

- ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم (آخری قسط) — ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۴
- پاکستانی یورنیورسٹیوں میں نصابات کی اسلامی تشکیل نو ایک عملی منصوبہ — ڈاکٹر محمد امین ۲۴
- تربیتِ اساتذہ: مسلسل حادثوں کا شکار — پروفیسر ملک محمد حسین ۲۸
- برطانوی فنڈز سے 'الف اعلان' کی تعلیمی مہم — اکمل سومرو ۳۲
- بچوں کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟ والدین کے لیے لائحہ عمل — ڈاکٹر عبدالکریم بکار ۳۴

**○تزکیۂ نفس**

- علماء و مصلحین کے فتنے اور خرابیاں — علامہ محمد یوسف بنوریؒ ۳۶
- عصرِ حاضر میں تزکیۂ نفس: تصوف کی اصلاح اور تربیت گاہ کے نئے ماڈل کی ضرورت — مدیر ۴۰

**○میڈیا**

سوشل میڈیا پر فحش اشتہارات اور جنسی کھلونوں کی تشہیر — پروفیسر عاصم حفیظ ۴۵

**○عالم اسلام اور مغرب**

- مغرب صدر اُردوان سے کیوں خائف ہے؟ — مدیر ۴۷
- اب امریکہ علماء کو استعمال کرے گا ۴۹

**○اسلام اور پاکستان**

الیکشن ۲۰۱۸ء ۔ ایک تجزیہ — پروفیسر ملک محمد حسین ۵۲

**○مکالمہ**

اہم دینی موضوعات پر قارئین سے تبادلۂ خیال — مدیر ۵۵

فکر و نظر

# غزالاں ہم نہ کہتے تھے

**انتخابات ۲۰۱۸ء میں دینی سیاسی جماعتوں کی شکست**

ہماری حسبِ توقع دینی سیاسی جماعتیں شکست سے دوچار ہوئیں۔ تحریک لبیک، تحریک اللہ اکبر (ملی مسلم لیگ)، جمعیت علماء اسلام (س)، جمعیت علماء پاکستان (ابوالخیر زبیر گروپ) اور جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام (ف) و چند دیگر جماعتوں کا اتحاد ایم ایم اے بھی شکست سے دوچار ہوا اور صرف چند نشستیں ہی جیت سکا۔ خود مولانا فضل الرحمن اور جماعت اسلامی کے سراج الحق، لیاقت بلوچ اور فرید پراچہ بھی ہار گئے۔

البرہان کے قارئین کو یاد ہوگا کہ تقریباً ایک سال پہلے کراچی کے بزرگ اسلامی دانشور اور ماہر معیشت جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے اس موضوع پر ایک زوردار سلسلۂ مضامین شروع کیا کہ جماعت اسلامی کو انتخابات میں ضرور حصہ لینا چاہیے، ایم ایم اے کا احیاء کرنا چاہیے، اصلاحی جماعتوں کی تائید لینی چاہیے اور اسلام کے حق میں جذباتی نعروں سے ماحول کو گرما کر اسلامی انقلاب برپا کر دینا چاہیے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ٹرمپ اور مودی روایتی اسٹیبلشمنٹ کی مخالفت کے باوجود جیت سکتے ہیں تو جماعت اسلامی (اور پاکستانی دینی سیاسی جماعتیں) کیوں نہیں جیت سکتیں؟ ہم نے دلائل سے ان کا ردّ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ ہم نے پختہ ثبوتوں سے یہ موقف بھی پیش کیا تھا کہ مولانا مودودیؒ اپنی زندگی کے آخری حصے میں، ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں شکست کھانے کے بعد، اپنے اس موقف سے رجوع کر چکے تھے کہ جمہوری انتخابی جدوجہد ہی پاکستان میں اقامت دین کا واحد راستہ ہے۔

بہرحال آج کا سوال یہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتیں کیوں ہاریں؟ آئندہ کیسے جیت سکتی ہیں اور اس کے لیے مستقبل میں ان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوالات تفصیلی جوابات کے متقاضی ہیں، اور چونکہ پرچہ پریس جا رہا ہے، اس لیے ہم اپنے تفصیلی جوابات کو آئندہ شمارے تک مؤخر کرتے ہیں.... تاہم کچھ اصلاح طلب امور فوری اقدامات کا تقاضا کرتے ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کیے دیتے ہیں۔

## چند فوری اقدامات کی ضرورت

ان اقدامات کو ہم جماعت اسلامی اور دیگر مسلکی جماعتوں کے زیر عنوان ذکر کر سکتے ہیں:

### جماعتِ اسلامی

جماعت اسلامی کی قیادت کو حرکت اور فراست کا ثبوت دینا چاہیے اور فوراً اجتماع ارکان بلانے کا اعلان کرنا چاہیے جس میں کئی دن تک ارکان آزادی سے باہم تبادلۂ خیال کریں، کھلی تقریروں، تحریروں اور مباحثوں کا انعقاد ہو۔ اس میں موجود قیادت کو اپنے استعفیٰ پیش کرنے چاہئیں اور ارکانِ جماعت مستقبل کے لیے جو لائحہ عمل پیش کریں اس پر عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔

### مسلکی جماعتیں

ہماری رائے میں مسلکی جماعتوں کے غیر سیاسی بزرگ علماء کرام کو، جن کا سب احترام کرتے ہیں، متحرک ہونا چاہیے اور اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کو دین اور شریعت پر متحد کرنے کی بجائے مسلکی جماعتیں بنانا عدم اخلاص اور عدم فراست کا مظہر ہے۔ انہیں چاہیے کہ وہ پہلے قدم کے طور پر ہر مسلک کی دینی سیاسی جماعتوں کی قیادت سے استعفیٰ لیں اور پھر اپنے مسلک کے سب دھڑوں/ جماعتوں کو پہلے ایک جماعت بنائیں اور پھر دوسرے مسالک کے غیر سیاسی علماء کرام سے مل کر سب مسلکوں پر مشتمل ایک دینی سیاسی جماعت یا ان کا وفاق بنائیں جو ملک کے اسلامی مستقبل کے لیے کام کرے۔

نیز ان بزرگ علماء کرام کو مل کر اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دینی مدارس، مساجد اور دعوتی واصلاحی جماعتوں کا کردار اور طریق کار کس حد تک فرد اور معاشرے کی اسلامی تعمیر میں ممد ومعاون ہے اور اس کے لیے کن مزید اقدامات کی رضرورت ہے۔

## قارئین البرہان توجہ فرمائیں

البرہان کے فاضل قارئین میں سے جو لوگ انتخابات میں جماعت اسلامی اور مسلکی دینی سیاسی جماعتوں کی شکست کے اسباب اور اصلاح احوال کے مجوزہ اقدامات پر غور کرنے کا ذوق رکھتے ہوں، ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر سوچیں، لکھیں اور ہمیں بھجوائیں۔ ۱۸ ؍اگست ۲۰۱۸ء تک موصول ہونے والے منتخب مضامین ہم، ان شاء اللہ، اگلے شمارے میں شائع کریں گے اور باقی بعد میں۔ مدیر

تحقیق

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

# اسلامی علوم میں دائرہ ہائے تحقیق (آخری قسط)
## نوعیت، مقاصد اور ترجیحات

### مغربی تہذیب سے مرعوبیت

ذرا سوچیے! کہ مغرب سے مرعوبیت کا یہ طرزِ فکر جب اُن کے سامنے آئے گا تو کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ اس قسم کے لوگ اسلامی تہذیب کے سچے دِل سے قائل اور اس کے پیرو ہو سکتے ہیں؟ اور پھر وہی لوگ جوان کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکلتے ہیں، وہی آپ کے ملک کا نظام چلاتے ہیں، وہی آپ کے ملک کے سکرٹیری بنتے ہیں، وہی جنرل بنتے ہیں، وہی آپ کی حکومت کے کار پرداز بنتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں یہ بات کیسے اُتر سکتی ہے کہ اسلام چلنے کے قابل ہے اور چلانے کے قابل ہے۔ چنانچہ آپ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایک بڑے گروہ سے بات کر کے دیکھ لیں۔ آپ کو تھوڑی ہی دیر میں یہ محسوس ہو جائے گا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانے میں چلنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ سارے علوم انہوں نے جس انداز سے پڑھے ہیں اس کی وجہ سے اُن کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ کوئی طرزِ زندگی یا نظامِ حیات مغربی نظام زندگی سے بہتر ہو سکتا ہے اور وہ چل بھی سکتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قابل عمل صورت وہی ہے جو مغربی طرزِ زندگی کی ہے کیونکہ ایک چیز چل رہی ہے۔ کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے جبکہ دوسری چیز معطل ہے اور اُس کا کوئی اثر اُن علوم وفنون پر نہیں ہے جن کو وہ پڑھ رہے ہیں۔

### علوم کی اسلامی تشکیلِ نو

پھر تنقید کے کام کے ساتھ ساتھ دوسرا تعمیری کام جو ناگزیر ہے اور جسے کرنے کی شدید ضرورت پیدا ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ تمام علوم کو اسلام کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا جائے تاکہ ہماری نئی نسلیں اسلام کے برحق ہونے پر واقعی مطمئن ہو سکیں اور ان کو یہ اطمینان ہو کہ یہ چیز چلنے کے قابل ہے اور اُن کے اندر یہ ارادہ پیدا ہو کہ اس کو چلانا چاہیے۔

## نصابی کتب کی اسلامی تناظر میں تدوین

اس کے بعد جو تیسرا کام ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ ایک نصاب مرتب کیا جائے جو اس طرز پر تعلیم کے قابل کتابیں تیار کرے۔ ورنہ ابھی تک جو صورتِ حال ہے وہ یہ کہ نیچے سے اوپر تک جس کو دیکھیے وہ یہ بات کہتا ہے کہ ہم اصلاحی تعلیم اس ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں لیکن اس وقت تک کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی کہ یہ مختلف علوم جو ہماری یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں ان پر کتابیں بھی اسلام کے نقطۂ نظر سے تیار کی جائیں۔ میں آپ سے ابھی عرض کر چکا ہوں کہ کمیونسٹ اس بات کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ اکنامکس کی ایسی کتابیں پڑھائیں جو بورژوا ماہرین معاشیات نے لکھی ہیں۔ وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ وہ ایسا فلسفۂ قانون پڑھائیں جو سرمایہ داروں کے ماہرین قانون نے مرتب کیا ہے۔ غرض اس طرح وہ نہ صرف یہ کہ سوشل سائنس بورژوا لوگوں کی لکھی ہوئی پڑھانے کے لیے تیار نہیں بلکہ وہ ایک سوویٹ سائنس تیار کر رہے ہیں یعنی معاملہ محض عمرانی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ سائنس کو بھی وہ کہتے ہیں کہ یہ سوویٹ سائنس ہے۔ تمام سائنٹفک کتابوں کو انہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے مرتب کیا ہے اور وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کمیونسٹوں کی نئی نسل کی پرورش سرمایہ داروں کے مرتب کردہ سائنسی ذخیرہ سے کریں۔

ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ تمام اوقات (گھنٹوں) میں تو ہم وہ علوم پڑھائیں جو مغربی مصنفین کی کتابوں میں ملتے ہیں اور صرف ایک پیریڈ میں لوگوں سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ایک ہستی کا نام خدا بھی ہے جسے تم کو جاننا چاہیے اور ایک ہستی کو اللہ نے رسول بھی بنا کے بھیجا تھا۔ لیکن اُس خدا اور اُس رسول کا کوئی مظاہرہ (Function) اُن کو باقی پیریڈز میں نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کے برعکس تمام علوم وفنون اس طرز پر پڑھائے جا رہے ہیں جس طرز پر انہیں اہل مغرب نے مرتب کیا ہے، یا ہمارے ہاں کے اُن لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو اہل مغرب کی مکھی پر مکھی مارنے کے عادی ہیں۔ اس سے آپ بالکل توقع نہ رکھیں کہ آپ کے ہاں وہ نسل کبھی پروان چڑھ سکے گی جو یہاں اسلام کا احیاء کرے اور احیاء کرنا تو درکنار اسلام کو باقی رکھ سکے۔ یہ راستہ سیدھا اپنی انفرادیت کو ختم کرنے کی طرف جا رہا ہے۔ روز بروز ہماری انفرادیت فنا ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہماری

حکومت اور ہمارے برسراقتدار طبقے اور ہمارے ہاں کے بااثر طبقے، خواہ وہ تجار کے ہوں اور خواہ صناعوں کے، اہل مغرب کے سامنے یہ نقشہ پیش کررہے ہیں کہ ہم میں اور تم میں کسی لحاظ سے بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ جو تمہاری تہذیب وہ ہماری تہذیب۔ جو تمہارا تمدن وہ ہمارا تمدن۔ جو تمہارے اخلاق وہ ہمارے اخلاق۔ جو تمہاری قدریں وہ ہماری قدریں۔ حتیٰ کہ ہم اس بات کو بھی مان گئے ہیں کہ جس جس حرام کو انہوں نے حلال کیا ہے وہ واقعی حلال ہے اور یہ غلطی ہماری تھی کہ اسے حرام قرار دے دیا تھا یا غلط فہمی تھی کہ وہ حرام ہے۔ اس صورتِ حال میں کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ یہاں اسلام باقی بھی رہ سکے گا کجا آپ یہ توقع کریں کہ وہ نسلیں جو اس طریقے پر پرورش پا رہی ہیں اور یہ ذہنی تربیت پا رہی ہیں، وہ یہاں کبھی اسلام کے احیاء کے لیے بھی کام کرسکیں گی اور اسلامی تہذیب وتمدن کی علمبردار بھی بن سکیں گی؟

## بنگلہ زبان میں اسلامی لٹریچر کی کمی

ایک اور مسئلہ جو اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کا ایک حصہ جس کی آبادی اکثریت میں ہے، اُس کی زبان میں اسلام کے متعلق لٹریچر نہ ہونے کے برابر ہے۔ مغربی پاکستان میں کم از کم اُردو ایک ایسی زبان ہے جس میں اچھا خاصا اسلامی لٹریچر موجود ہے، چاہے وہ سکولوں میں نہ پڑھایا جاتا ہو مگر وہ باہر موجود ہے کہ مدرسوں اور کالجوں سے فارغ ہونے والا یا اپنے فارغ اوقات میں مطالعہ کرنے والا کچھ نہ کچھ دین کی معقول باتیں حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے مشرقی حصے میں بنگلہ زبان میں یہ کچھ بھی موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس معاملہ یہ ہے کہ بنگلہ زبان کا لٹریچر اور بنگلہ زبان کے علوم وفنون زیادہ تر ہندوؤں کے لکھے ہوئے ہیں اور وہ بھی ایسے ہندوؤں کے جنہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب تھا۔ جنہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی کارنامہ انسانی تہذیب وتمدن میں نہیں ہے۔ مسلمان اگر رہا ہے تو محض لچے اور لفنگے کی حیثیت سے رہا ہے۔ مسلمان نہ کبھی محبت وطن رہا ہے اور نہ کبھی انسانیت کا خادم۔ آزادی کی تحریک میں بھی اُن کا کوئی حصہ نہیں ہے اور آزادی کے لیے قربانیاں صرف ہندوؤں نے دی ہیں۔

غرض جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ تھا اُن لوگوں نے تاریخیں لکھی ہیں اور مسلمان نوجوان اُن کو پڑھتے ہیں۔ انہوں نے ناول لکھے ہیں اور مسلمان نوجوان ادب کے ناطے انہیں پڑھتے

ہیں لیکن اسلام کے متعلق بہت ہی کم لٹریچر بنگلہ زبان میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمارے لیے انتہائی خطرناک صورتِ حال ہے، ہمارے ملک کا آدھا حصہ اور وہ حصہ کہ جس کی آبادی اکثریت میں ہے۔ اگر وہ اس حالت میں مبتلا رہے تو آپ اس حالت میں یہاں اسلام کے احیاء کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟

## عربی اور انگریزی میں اسلامی لٹریچر کی تیاری

اسی کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس ادارے میں جو کچھ مرتب کیا جائے وہ صرف اردو اور بنگلہ میں ہی نہ ہو بلکہ انگریزی اور عربی زبانوں میں بھی ہو۔ یعنی ترجمہ کا کام بھی ہم ساتھ ساتھ کرتے چلے جائیں اور انگریزی اور عربی دونوں میں ان چیزوں کو لائیں، عربی میں لانا اس لیے ضروری ہے کہ دجلہ سے لے کر اوقیانوس تک تمام مسلمان قومیں عربی زبان بولتی ہیں، اُن کی زبان عربی ہے۔ اس وقت اُن کی سولہ سترہ آزاد ریاستیں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی طاقت ہے اور دنیائے اسلام کا دل ہے۔ جب تک قرآن مجید سے مسلمان وابستہ ہیں لامحالہ وہ قرآن مجید کی زبان یعنی عربی وہ اس زبان کی اہمیت محسوس کریں گے اور اس کا اثر ہوگا۔ لہٰذا اگر وہ زبان کفر کی اشاعت کرنے لگے، اگر اُس زبان میں لوگوں کو فسق وفجور ملے۔ اگر اس زبان میں لوگوں کو الحاد ملے تو آپ غور کیجیے کہ اس سے زیادہ خطرناک کیا ہوسکتا ہے؟

مزید براں افسوس کی بات یہ ہے کہ عرب ممالک کے مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور تمدن کا غلبہ ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ہم ان سے بہت پہلے مغرب سے مغلوب ہوئے تھے لیکن اتنے مغلوب ہم نہیں ہوئے جتنے کہ وہ ان سے متاثر ہوئے، درانحالیکہ وہ ہمارے بعد مغلوب ہوئے۔ جتنی ریاستیں اس وقت عرب ممالک میں ہیں اُن کے کارفرما زیادہ تر مغربی ذہن کے لوگ ہیں، اور ایسا عملی کام وہاں بہت کم ہورہا ہے جو اسلام کے نقطۂ نظر کے ٹھیک مطابق ہو۔ تاہم وہاں بھی کام ہورہا ہے اور یہ خیال کرنا کہ وہاں کام نہیں ہورہا ہے غلط ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہاں جو کام ہورہا ہے اُس کا مفید حصہ اردو اور بنگلہ میں منتقل کریں تاکہ وہاں کی تحقیقات کو یہاں منتقل کریں۔ اور یہاں جو کچھ ہم کریں اُس کو عربی کے ذریعے وہاں منتقل کریں تاکہ یہ ایک مشترک ذخیرہ بن سکے۔ اور دوسرے مسلمان ملکوں میں بھی ایک صحیح اسلامی ذہن پرورش پاسکے اور وہاں کے کارفرما بھی اس بات پر مطمئن ہوسکیں کہ اسلام کو چلایا جاسکتا

ہے اور ان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ اس کو چلائیں اور ان کو وہ طریقہ معلوم ہو جس سے اسلام کو چلایا جا سکے۔

اس ضرورت کو ہم بھی پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور عرب ممالک میں بھی بعض حصوں میں یہ کام ہو رہا ہے۔ انگریزی میں اس کی متعدد وجوہ سے ضرورت ہے اور آپ خود بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ انگریزی میں اس چیز کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اوّل تو خود ہمارے ملک کا بالائی طبقہ انگریزی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں کچھ پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہے اور ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اور ہمارے اونچے طبقے میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے لیے اردو زبان میں اپنا نام لکھنا بھی مشکل ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے آدمی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کے صاحبزادے جو انجینئر ہیں، ان کو کچھ اسلام سے واقفیت پیدا ہو۔ چنانچہ ایک صاحب ان کو اسلام کی تعلیم دینے کے لیے مقرر کیے گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ اردو زبان میں کوئی دینی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اردو زبان میں وہ کچھ پڑھ ہی نہیں سکتے۔ لامحالہ ان کو انگریزی میں تعلیم دینے کی ضرورت پیش آئی حالانکہ وہ اسی ملک میں پیدا ہوئے ہیں، اور اسی ملک میں ان کا پورا خاندان پیدا ہوا ہے لیکن وہ اس ملک کی زبان سے واقف نہیں تھے کہ دین کی تعلیم اردو میں حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد کوشش کی گئی کہ کسی طرح وہ کم از کم قرآن مجید تو پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو ان کو اس قابل بنانے میں ایک مہینہ لگا کہ وہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اور سورۃ الفاتحہ پڑھ سکیں۔ وہ بیچارے کافی دنوں تک یہ کہتے رہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اُلٹا کیسے لکھا ہوا ہے یعنی جو سیدھا ہے اُن کے نزدیک اُلٹا ہے۔ چونکہ ساری عمر اُن کی بائیں سے دائیں لکھنے اور پڑھنے میں گزری ہے اس لیے دائیں سے بائیں جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا تھا اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اُن کے سر میں درد ہونے لگتا تھا کہ بھلا کوئی زبان ایسے بھی لکھی جاتی ہے۔ یہ طبقہ ہمارے ہاں موجود ہے اور یہی طبقہ ملک کے معاملات کو چلا رہا ہے۔ اسی کے ہاتھوں میں ملک کی باگیں ہیں۔ اب کہاں یہ لڑائی لڑنے جائیں کہ پہلے اردو سیکھو تو ہم تمہیں دین سکھائیں گے۔ اس لیے ہمیں ان کے لیے اسی زبان میں وہ مواد فراہم کرنا ہے جس میں وہ سیکھ سکتے ہیں.... تاکہ کم از کم اُن کے عقیدے اور ایمان کو تو بچایا جا سکے۔

اس کے علاوہ باہر کے ملکوں میں اگر آپ اسلام کی تعلیم کو پھیلانا چاہیں تو کم از کم ہمارے لیے انگریزی ہی وہ واسطہ ہے کہ جس کے ذریعہ ہم یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یوں تو تنہا ایک انگریزی ہی بین الاقوامی زبان نہیں ہے، دوسری زبانیں بھی ہیں جن میں اسلام کے متعلق لٹریچر تیار کرنے کی ضرورت ہے لیکن ہمارے پاس انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں نشر واشاعت کے ذرائع نہیں۔ اور اگر ایک مرتبہ انگریزی زبان میں اسلامی علوم کو ان کی صحیح شکل میں پیش کیا جائے تو اس کے بعد دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمے ہونے کا امکان ہے مثلاً ہماری ایک کتاب ہے جس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا، اب اُس ترجمہ سے جرمن زبان میں اور جاپانی زبان میں بھی ترجمے ہوئے ہیں اور دوسری زبانوں مثلاً فرنچ میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ غرض دوسری زبانوں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا کام اللہ کے دوسرے بندے کریں گے۔ بالفعل ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انگریزی زبان میں اسلام کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی جاسکیں۔ یہ دنیا میں اسلام کی ترویج کا ایسا ذریعہ ہے جو پوری طرح استعمال کیے جانے کی شدید ضرورت ہے۔

ہمارے پیش نظر اس کے ساتھ ساتھ دو کام اور بھی ہیں، اگرچہ اہمیت میں کم ہی سمجھے جائیں لیکن فی الواقع ان کی بھی بڑی ضرورت ہے:

ایک کام یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جو مسلمانوں کی آبادیاں منتشر ہیں، وہاں اُن کی نئی نسلوں کے ارتداد کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے مثلاً ویسٹ انڈیز میں اور دوسرے دور دراز کے جزائر میں۔ خود امریکہ، کینیڈا اور جنوبی امریکہ کے مختلف حصوں میں جو مسلمان آبادیاں منتشر ہیں وہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ کفار کی حکومت بھی ہے اور اکثریت بھی ہے۔ ان کی تعلیم کا سارا نظام غیر اسلامی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی خاص الگ انتظام نہیں ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسلیں روز بروز غیر مسلم اکثریت میں جذب ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ان کو اسلام کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ ہم مسلمانوں کی اولاد ہیں اور اس لیے ہم مسلمان ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی ضروریات کے مطابق کچھ مختصر نصاب ایسا تیار کر دیا جائے کہ کم از کم وہاں کی جو نئی نسلیں ہیں وہ مسلمان رہ سکیں اور ان کو اسلام کے متعلق ضروری معلومات حاصل ہوسکیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۱۳)

تعلیم و تحقیق ابن الحسن عباسی

## عالم اسلام کے نامور ترک محقق کی رحلت

# ڈاکٹر محمد فواد سیزگین - فی ذمۃ اللہ

عالم اسلام کے نابغۂ روزگار محقق ڈاکٹر فواد سیزگین کا ترکی میں ۳۰ جون ۲۰۱۸ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ استنبول میں سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی تدفین ہوئی۔ ان کی عمر ۹۴ سال تھی۔ جامعہ استنبول سے ۱۹۴۷ء میں گریجویشن اور ۱۹۵۰ء میں ایم اے عربی کیا اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں عربی زبان و ادبیات میں پی ایچ ڈی کر کے وہاں استاذ مقرر ہوئے۔

۱۹۶۰ء میں فواد سزگین جرمنی گئے، فرینک فرٹ یونیورسٹی سے دوبارہ پی ایچ ڈی کیا اور وہیں سائنسی علوم کی تاریخ کے استاد مقرر ہوئے اور یہیں انہوں نے شاندار علمی اور تاریخی خدمات انجام دیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور یادگار کارنامہ ان کی کتاب 'تاریخ التراث العربی' ہے۔ یہ بارہ جلدوں میں جرمن زبان میں لکھی گئی ہے۔ اسی کتاب پر ان کو ۱۹۷۹ء میں پہلی بار سعودی حکومت نے اپنے سب سے بڑے اعزاز ''شاہ فیصل ایوارڈ'' سے نوازا تھا۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ جرمنی کی فرینک فرٹ یونیورسٹی میں اسلامی اور عربی علوم کے لیے ایک مستقل معہد اور ذیلی ادارے کا قیام ہے۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے اس شعبے کی بنیاد رکھی۔ اس کے کتب خانے میں دنیا بھر سے مخطوطات اور نادر اسلامی کتابوں کے مسودات کو جمع کر کے محفوظ کیا گیا، جن کی تعداد ۲۵۰۰۰ سے زائد ہے۔ ۱۳۰۰ اصل مخطوطات اور ۷۰۰۰ مخطوطات کی فوٹو کاپیاں ہیں۔ موضوعاتی فہرستیں تیار کر کے اس نادر ذخیرے سے استفادہ کو آسان کر دیا گیا ہے۔ اس ادارے سے اسلامی تاریخ اور مختلف اسلامی علوم و فنون پر اشاعتی سلسلوں اور منشورات کو اگر جمع کیا جائے تو اس کی جلدیں ایک ہزار سے اوپر بنتی ہیں۔

ڈاکٹر فواد سیزگین نے ۲۰۱۰ء میں استنبول یونیورسٹی میں اور ۲۰۱۳ء میں سلطان محمد فاتح

یونیورسٹی میں علمی اور تحقیقی شعبوں کی بنیاد بھی رکھی اور ایک بانی کی حیثیت سے ان شعبوں کی سرپرستی اور رہنمائی کرتے رہے۔ ڈاکٹر فواد سیزگین کو جرمن اور ترک حکومت نے بھی ان کے علمی کاموں کے اعتراف میں سب سے بڑے سرکاری ایوارڈ واعزاز سے نوازا۔ مختلف ملکوں کی کئی یونیورسٹیوں نے انہیں اعزازی ڈگریاں دیں۔ انہوں نے جرمنی ہی کی ایک مستشرق خاتون 'اورسولا' سے شادی کی جو زندگی بھر ان کے علمی کاموں میں ان کی معاون رہیں۔

ڈاکٹر فواد کو ترکی، عربی، جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا، انہوں نے بہت مصروف زندگی گزاری اور وہ ۸۰ سال کی عمر میں بھی اٹھارہ گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے۔

## بقیہ: اسلامی علوم میں دائرہ ہائے تحقیق

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کی کوششوں کے نتیجے میں جو افراد اسلام قبول کرلیں ان کو اسلام کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔ اس کے بغیر کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔

اس مقصد کے لیے ایک ایسا مختصر سا نصاب تیار کرنے کی ضرورت ہے جو ضروری فقہی مسائل پر مشتمل ہو تا کہ جو لوگ اسلام قبول کرتے جائیں وہ اس کی مدد سے مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔ وہ جان سکیں کہ طہارت اور نجاست کیا چیز ہیں اور ان میں کیا فرق ہے؟ طہارت کیسے حاصل کی جائے؟ نماز کیسے پڑھی جائے؟ روزے کے احکام کیا ہیں؟ زکوٰۃ کے احکام کیا ہیں؟ اس کے ساتھ ہی اُن کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ خود اسلام کے مبلغ بن سکیں۔ اس کے لیے ان کو ایسا مواد فراہم کرکے دیا جائے جس سے وہ اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور اس کی تبلیغ کرسکیں۔ اس چیز کے لیے بھی کچھ چیزیں تیار کرنا ہمارے پیش نظر ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی کے ماسوا اگر دوسری زبانوں میں بھی اس کا انتظام ہوسکے تو جیسا کہ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ یہ کام سواحلی زبانوں میں بھی کریں تا کہ افریقہ میں یہ چیزیں پھیل سکیں۔ جیسے جیسے دوسری زبانوں میں یہ کام کرنے کے امکانات پیدا ہوتے جائیں گے، ان شاء اللہ ان سے فائدہ اُٹھایا جائے گا۔

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر ذاکر حسین [۱]

# ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم (آخری قسط)

ان نئی تربیت گاہوں کو اگر واقعی گھر کا نعم البدل اور گھر کی کمیوں کو پورا کرنے والا بنانا ہے تو اس کی عمارت، اس کے باغیچے، اس کے کھیل کا انتظام، اس میں کھانا تیار کرنا اور کھانا کھلانے کا ستھرا اہتمام، اس میں بچوں کے پالتوں جانوروں کی گنجائش، بچوں کے لیے صفائی اور طہارت کے مواقع، ان کے لیے نیچے اور ہلکے ساز وسامان، غرض بہت سی باتوں کو سامنے رکھ کر ہر چیز کی جگہ نکالنی ہوگی۔ ہمارے ملک میں ابھی تعلیمی عمارتوں میں تعلیمی ضرورتوں کا خیال ذرا کم ہی رکھا جاتا ہے۔ ہر قسم کی عمارت ہر قسم کے کام میں لائی جاسکتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ملک کے اچھے ماہرین تعمیرات و ماہرین تعلیمات باہمی مشورے سے ان تربیت گاہوں کے لیے نمونے کے نقشے بنائیں جنہیں مقامی خصوصیات کے پیشِ نظر کچھ بدل کر ہر جگہ کام میں لایا جاسکے۔ برطانیہ کی نرسری اسکول ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۴ء کے قانونِ تعلیم کے پارلیمنٹ میں پاس ہونے سے پہلے ہی اپنی ایک کمیٹی بٹھادی تھی جس نے برطانیہ کے حالات سامنے رکھ کر ایک رپورٹ بھی شائع کردی ہے جس میں ان نئی تربیت گاہوں کے لیے جو اس قانون کے تحت سارے ملک میں بننے والی ہیں، مکانات اور ساز وسامان سے متعلق تمام ضروری امور پر ماہرین کے مشوروں کا خلاصہ درج کردیا گیا ہے۔ کاش ہم بھی اپنے کاموں میں اس پیش بینی کا ثبوت دے سکیں! کیوں نہ آپ کی فیلوشپ اس قسم کے کام اپنے ذمے لے لے؟

## ابتدائی تعلیم کا مسئلہ [۲]

آپ کی کانفرنس کے سامنے دوسرا بحث طلب مسئلہ ابتدائی تعلیم کا ہے، جسے آج کل ملک کی تعلیمی اصطلاح میں بنیادی تعلیم کہنے لگے ہیں یہ ۵، ۶ سال سے اوپر کی عمر کے لڑکے لڑکیوں

---

[۱] ماہر تعلیم، بانی وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی و سابق صدر بھارت

[۲] چونکہ یہ ایک تقریر ہے لہٰذا ظاہر ہے اس میں ذیلی عناوین وغیرہ نہیں ہوسکتے تھے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے اس تحریر میں ذیلی عنوانات اپنی طرف سے شامل کردیے ہیں اور معمولی ایڈیٹنگ بھی کی ہے۔

کی تعلیم کا مسئلہ ہے، اس عمر کے لڑکے اور لڑکیوں میں۔ سے کچھ کی تعلیم تو ہمیشہ جیسی تیسی ہوتی ہی رہی ہے لیکن جب تک تعلیم کا یہ کام نجی کام ہوتا ہے بچوں کے سر پرست اپنی مرضی اور بچے سے متعلق اپنے منصوبوں کے پیشِ نظر جس قسم کی اور جتنی تعلیم کا انتظام چاہتے ہیں کرتے ہیں یا استاد اپنی مرضی سے شاگرد کو جو چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس لیے تعلیم کے مقاصد اور اس کے طریقۂ کار کے متعلق بہت اختلاف رہتا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے راہی اتنی راہیں۔ لیکن جب تعلیم جماعت کا وظیفہ بن جاتی ہے تو جماعت قدرتی طور پر ہمیشہ یہ چاہتی ہے کہ تعلیم سے متعلم کو اپنا کارآمد رُکن بنائے۔ اسے کارآمد بنانے میں جماعت کی طرف سے بڑی زیادتیاں ہوسکتی ہیں اور برابر ہوتی رہی ہیں۔ کارآمد بنانے کی خاطر آدمیت کے حق چھین لیے جاتے ہیں، سانچوں میں کس کر ہر انفرادی خصوصیت کا جھول مٹا دیا جاتا ہے اور ایک سے ترشے ترشائے ڈھلے ڈھلائے شہری بنانے کی خواہش کو بے روک ٹوک پورا کیا جاتا ہے۔ پر اگر جماعت کا نظام جمہوری ہو تو چونکہ جمہوریت انسان کی بحیثیت انسان قدر کرتی ہے اس لیے اس کی انفرادیت کا پاس کرنے پر بھی مجبور ہوتی ہے۔ مگر کارآمد آدمی تو اُسے بھی درکار ہوتے ہیں بلکہ اس کا تو وجود ہی اپنے شہریوں کی صحیح تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ دوسرے اگر اپنے لیے کارآمد اور مطیع رعایا بنانے کی فکر میں رہتے ہیں تو اسے اپنے حقیقی آقاؤں کی تربیت کا کام انجام دینا نہیں۔ چنانچہ جہاں بھی جمہوری سیاسی ادارے فروغ پاتے ہیں تعلیم کو عام کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مفت انتظام کرنا ہوتا ہے اور چونکہ معاملہ جماعت کے اچھی یا بُری جماعت بننے کا نہیں بلکہ اس کی موت وزیست کا ہوتا ہے اس لیے تعلیم کو بخت و اتفاق پر نہیں چھوڑا جاسکتا بلکہ لازمی بھی کرنا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جوں جوں سیاسی ارتقا جمہوریت کی طرف بڑھا ہے تعلیمی مسئلہ جماعتی زندگی کا اہم ترین مسئلہ بنتا گیا ہے۔ اور اس وقت کہ ہم آزاد جمہوری حکومت سے بہت قریب ہیں، چاہے ایک متحدہ ہندوستان میں چاہے علیحدہ پاکستان اور ہندوستان میں، اس لیے اس بات پر شاید سب متفق ہوں گے کہ ہمیں اتنی مدت کے لیے، جتنی جماعتی مقاصد کے پیش نظر ضروری نظر آئے، اپنے تمام لڑکے لڑکیوں کے لیے عام، مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس پر بھی سب کو اتفاق ہوگا کہ یہ مدت اگر ۴ یا ۵ ہی سال کی ہوئی تو کام نہ چلے گا اور خودمختاری اور جمہوری آزادی کا بوجھ اٹھانے والے شہریوں کی تیاری کے لیے فی الحال کم سے کم ۷ یا ۸ سال کی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا اور آگے چل کر اس مدت کو شاید اور بڑھانا

پڑے۔

## پرائمری تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟

لیکن یہ چیزیں جن پر میں نے کہا ہے کہ اتفاق ہے، بس خارجی ڈھانچہ ہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ تعلیم ہو کیسی؟ اس کے جواب کا سوچنا اور اسے صحت سے برابر قریب تر لانے کی کوشش جمہوری جماعت میں یوں تو سب کا کام ہے مگر خصوصیت کے ساتھ اس کے تعلیمی کام کرنے والوں کا فرض ہے۔ ہمیں اس کانفرنس میں بھی اس پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ہم یا تو جماعت کے اغراض کو پہلی جگہ دے سکتے ہیں یا فرد کی تعلیم پذیری کے امکانات کو۔ جماعت کی طرف سے تعلیم کا انتظام ہو، اس کی غایت جماعت کا استحکام اور اس کی ترقی ہو تو آسانی سے یہ ہوسکتا ہے کہ ہم جماعت کی ضرورتوں ہی کو سامنے رکھ کر اس سوال کا جواب دے دیں۔ لیکن یاد رہے کہ اس میں بڑے خطرے ہیں۔ جمہوری جماعت بھی کوتاہ اندیشی سے بالکل پاک نہیں ہوتی۔ باوجود انفرادیت کے احترام کے دعوؤں کے جماعتی زندگی کی ضرورتیں عملاً اس انفرادیت کا انکار کراسکتی ہیں اور جمہوری تعلیمی نظام بھی آمرانہ نظاموں کی طرح انسان کی انسانیت کو فنا کر کے اپنے شہریوں میں مشینوں کی سی کارکردگی پیدا کرنے کی تدبیریں کرسکتا ہے، وقتی فائدوں کے لیے مستقل مقاصد کو پس پشت ڈال سکتا ہے اور حال پر مستقبل کو دنیا پر آخرت کو قربان کرسکتا ہے۔ اس لیے صحیح راستہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم فرد کے نقطۂ نظر سے بھی تعلیم کی اہمیت پر غور کریں اور جماعت کے نقطۂ نظر سے بھی۔ اور دیکھیں کہ اگر دونوں میں کوئی تضاد ہے تو وہ کیسے حل ہو؟ جہاں نہ ہو تو اسی صورت کو اختیار کیا جائے۔

## ذہنی تربیت

تعلیم کے عمل میں فرد اور جماعت کے درمیان پہلے دن سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ تعلیم کا کام کرنے والے ہیں، آپ سے تو پوشیدہ نہ ہوگا کہ تعلیم یعنی واقعی ذہنی تربیت کیسے ہوتی ہے۔ ذہن اپنی نمو کے لیے جسم کی طرح غذا چاہتا ہے یہ غذا اسے کہاں سے ملتی ہے؟ جماعت کے تمدن سے، اس کی مادّی اور غیر مادّی تحصیلات سے، اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دست کاری سے، اس کے نظام اخلاق سے، اس کے رسم ورواج سے، اس کی سماجی زندگی کے نمونوں سے، اس کے گاوؤں، قصبوں، شہروں کی

تنظیمات سے، اس کی موسیقی سے، اس کی مصوری سے، اس کی تعمیرات سے، اس کی دکانوں سے، اس کے کارخانوں سے، اس کی حکومت کے انتظامات سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے، غرض اس کی رنگارنگ تخلیقات سے۔

جماعتی تمدن کی یہ ساری مادّی اور غیر مادّی چیزیں جو نمو پذیر دماغ کے لیے غذا کا کام دیتی ہیں خود بھی کسی نہ کسی ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کسی نہ کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں یہ روپ لیا ہے۔ کسی انسانی ذہن ہی نے ان میں اپنی توانائی کو محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں انسانی ذہنوں کی بصیرتیں، آرزوئیں اور کاوشیں ہی تو مضمر ہیں۔ یہ سب کسی متاعِ ذہنی رکھنے والے کا چھپا خزینہ ہے یا کسی سر شوریدہ کی بالیں آسائش۔ غرض سب ذہن انسانی کی رہین منت ہیں اور اس لیے سب کی اپنی اپنی ذہنی ساخت ہے۔

جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان کی چھپی ہوئی قوتیں آشکار ہوتی ہیں۔ ان میں سوئی ہوئی توانائیاں اس نئے ذہن میں جاکر بیدار ہوتی ہیں۔ اس کے لیے یہ دفینے اپنا منہ کھول دیتے ہیں اور پُرسکون بالینوں سے اس کے لیے پھر شورِ ہاؤوہُو اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر تربیت خواہ ذہن کے لیے ہر تمدنی چیز اپنی مخفی قوتیں پیش نہیں کرتی۔ جسمانی غذاؤں کی طرح ذہنی غذائیں بھی سب کو ایک ہی سی نہیں راس آتیں۔ کسی کو کچھ بھاتا ہے کسی کو کوئی اور۔ راز اس کا یہ ہے کہ ہر ذہن کو وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت کے مطابق ہو۔ یہی تعلیم کا بنیادی گر ہے۔ اس کو بھولنا یا اس کے خلاف چلنا ایسا ہے جیسے اندھے کو رنگ اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش۔ جس دماغ کی ساخت ادبی کاوشوں کے نتیجوں کے مطابق ہو اسے صنعتی اشیاء تمدن سے، جس کی ساخت علمی اور نظری چیزوں سے مناسبت رکھتی ہو اُسے عملی چیزوں سے تعلیم دینا یا اس کے برعکس، سب تعلیم کی ماہیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اصلی ذہنی تربیت کے دروازوں کو بند کرکے آدمیوں کو طوطوں اور سرکس کے جانوروں کا مرتبہ دینا چاہتی ہے۔

## عملی تربیت

اچھا تو اس اصول کا تقاضا ۶، ۷ سال کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے لیے کیا ہے؟ اگر ایسا ہو کہ ہر لڑکے لڑکی کی تربیت ذہنی الگ الگ تمدنی اشیاء ہی سے ہو سکتی ہے تو پھر کسی عام نظام کے

بنانے کی دُشواریاں ناممکن کی سرحد تک پہنچ جاتیں۔عمومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کی خوش بختی ہے کہ اس عمر میں تفریق ذہنی پیدا ہونے سے پہلے عملی رجحان بچوں میں بہت عام بلکہ یوں کہیے کہ ہمہ گیر ہوتا ہے۔اس عمر میں بچے چاہتے ہیں کہ کچھ بنائیں بگاڑیں،توڑیں جوڑیں۔ ان کے ہاتھ کام کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ان کی تربیت ذہنی کے لیے اس عمر میں فطرت کا منصوبہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہاتھوں کی مدد سے سوچیں، چیزوں کو برت کر پہچانیں اور کام کر کے سیکھیں۔ یہ بڑی ہی گمراہی ہے کہ ہم اس عمر کے بچوں کے لیے ذہنی تربیت کے اس امکان کو یعنی عملی کام کو ان کی تعلیم میں جگہ نہیں دیتے۔اور فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر اپنی من مانی تدبیروں سے اعلیٰ تربیت کی جگہ خالی ملمع کاری پر زور دیتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں دورائی کی ذرا گنجائش نہیں ہے کہ اس منزل میں عملی کام کو تعلیم سعی کا مرکز بنایا جائے۔

تعلیم پانے والے اور ذریعہ تعلیم میں مطابقت کے علاوہ اس منزل پر ہاتھ کا کام خود ذہنی کام کی ذہنی ورزش اور ذہنی ورزش سے ذہنی نمو کی مفید ترین شکل ہے۔اس کے ذریعے جو ہنر مندی اور جو واقفیت پیدا ہوتی ہے وہ ذہن کو جلا دیتی ہے۔ جو خالی کتابوں سے حاصل ہو وہ اکثر و بیشتر اس غرض کے لیے بے کار ثابت ہوتی ہے۔ہم تعلیم کا کام کرنے والوں کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہنر مندی اور ہر واقفیت نہ ذہنی تربیت کی وجہ ہوتی ہے، نہ اس کی علامت اور نہ اس کا پیمانہ۔ واقفیت بھی دو طرح کی ہوتی ہے اور ہنر مندی بھی دو طرح کی۔ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لیے دوسرے کام کرتے ہیں،ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے،خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے، جز و ذہن بنتی ہے، ذہن کو روشن کرتی ہے، پھر اس میں نظر پیدا کرتی ہے۔اسی طرح ایک ہنر مندی میکانکی ہنر مندی ہوتی ہے۔اس میں سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں،بس مشقت درکار ہے۔ جو کچھ پہلے سے مقرر ہے اس کی تکرار کرتی ہے۔ پہلے سے جو کچھ دوسروں نے معین کر دیا ہے اسے پیدا کرتی ہے۔ایک ہنر مندی میکانکی نہیں ہوتی، ذاتی صلاحیت کی بنا پر نئی اقدار پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔اسے تخلیقی ہنر مندی کہہ سکتے ہیں۔روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے نہ روح کو بالیدگی۔اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لیے ایک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار، ذہن کو تربیت

دیتا ہے، روح کی پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشا جاتا ہے۔ یہی حال میکانکی ہنرمندی کے مقابلے میں تخلیقی ہنرمندی کا ہے۔ حقیقی تعلیم یعنی ذہن کی سچی تربیت تجربے والے علم اور تخلیقی ہنرمندی دونوں کی خاطر اپنے بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام کو داخل کرنا اور اس سے صحیح تعلیمی کام لینا ضروری ہے۔

اس مطالبے سے بعض لوگ جھٹ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ پھر خبری کتابی علم اور میکانکی ہنرمندی کے لیے مدرسے میں کوئی جگہ ہی نہ ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ ذرا عجلت کرتے ہیں اور اصولوں کو زندگی کا خادم نہیں بناتے بلکہ زندگی کو نام نہاد اصولوں کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ ایک صحیح بات کو مبالغے کے ساتھ پیش کر کے اسے مہمل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ نہ ہر تخلیقی کام لازماً تعلیمی کام ہوتا ہے نہ ہر میکانکی کام کو تعلیم گاہ سے دیس نکالا دینا ہی لازمی ہے۔ نہ ہر تجربی علم تعلیم ہے نہ ہی سب کتابوں کو سپرد آتش کرنا ضروری۔ ذرا تامّل کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تعلیمی اعتبار سے بارآور کام وہ ہوتا ہے جس میں پہلے کام کرنے والے کو مسئلے کا واضح احساس ہو، وہ اپنے کام کا ذہنی خاکہ بنائے، اس کے وسائل سوچے، کام کی ممکن راہوں میں سے کسی ایک کو بوجوہ منتخب کرے، پھر اس کام کو کر گزرے، کرنے کے بعد اپنے ابتدائی منصوبے اور خاکے کو سامنے رکھ کر اسے جانچے، اس کی خوبی پر خوش ہو اور اس کی غلطیوں سے سبق لے اور آئندہ بہتر طریق پر اسے انجام دینے کے لیے آمادہ ہو۔ تعلیمی کام میں یہ منزلیں ضروری ہیں۔ یہی اس کام کو تربیتی صفت بخشتی ہیں۔ خبری علم اور میکانکی کام میں یہ منزلیں نہیں ہوتیں اس لیے وہ صحیح تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ لیکن پھر بھی تعلیمی کام میں ان کے لیے جگہ ہے اور بعض اعتبار سے خاص اہم جگہ۔ ہوتا یہ ہے کہ حقیقی تعلیمی کام کے سلسلے میں کام کرنے والوں کو بہت سی ایسی واقفیت درکار ہوتی ہے جسے سب کو اگر وہ تجربے ہی سے حاصل کرنا چاہیں تو عمر بیت جائے۔ بہت سے تخلیقی تعلیمی کاموں میں ایسی ہنرمندیوں کی ضرورت پڑتی ہے کہ اگر وہ پہلے سے حاصل کر کے میکانکی طور پر کام میں نہ لائی جاسکیں تو یہ منصوبہ پورا ہی نہ ہو سکے۔ ایسی صورتوں میں میکانکی مہارت اور خبری علم تجربے اور تخلیق کے منصوبوں میں مددگار کی حیثیت سے شامل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی حیات پرور صحبت میں ان کی مردنی بھی زندگی کی معین ہو کر انہیں زندگی بخش دیتی ہے۔

تعلیمی کام کی جو خصوصی منزلیں مَیں نے اوپر بیان کیں وہ خالص ذہنی کام میں بھی ہوسکتی ہیں، اخلاقی فیصلوں میں بھی، ادبی کاوشوں میں بھی اور ہاتھ کے عملی کام میں بھی۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن ادنی تامل سے واضح ہوجائے گا کہ ہاتھ کے کام میں یہ منزلیں بہت وضاحت سے کام کرنے والے کے سامنے آسکتی ہیں۔ اس لیے اگر ہم تجربی علم اور تخلیقی ہنرمندی کو حقیقی مانیں تو اپنے ان بنیادی مدرسوں میں ہاتھ کے کام سے یہ تربیتی خدمت لینے کی تدبیر کرنا اور بھی ضروری ہے۔

## فرد اور معاشرے کا مشترکہ مفاد

یہ جو عملِ تعلیم کی ماہیت، تعلیمی کام، تجربی علم اور تخلیقی ہنرمندی کی تربیتی قوت کے تقاضوں سے ہم فرد کی پوری ذہنی نشوونما کی خاطر ہاتھ کے کام کو بنیادی مدرسوں میں رواج دینا چاہتے ہیں، حسن اتفاق دیکھیے کہ جماعت کے مفاد کا مطالبہ بھی یہی ہے۔ جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنی زندگی کا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے، اس کی تعلیم گاہیں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خودغرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سوادِ اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔ کہیں اور یہ جائز ہو کہ نہ ہو لیکن ایک جمہوری جماعت میں تو یہ ایک ناقابل تصور اقدام ہے۔ ہاتھ کے کام کو مدرسے میں جگہ دے کر یہ جمہوری جماعت دراصل وہ کام انجام دے گی جو اس کا پہلا تعلیمی مقصد ہوسکتا ہے یعنی کارآمد شہری پیدا کرنا کہ جمہوریت کی روح، فرد کا احترام باقی رہے، فرد اس طرح کارآمد بنے کہ اپنی انفرادیت کو بھی اسے تجنا نہ پڑے اور اپنے انفرادی تربیتی امکانات سے بھی محروم نہ کیا جائے۔

اچھا! اگر ہم نے فرد اور جماعت کے تعلیمی مطالبوں میں یہ ہم آہنگی پاکر اپنے بنیادی مدرسوں کو کام کا مدرسہ بنا دیا اور ان میں تجربی علم اور تخلیقی کام اور ان کے معاون بلکہ خادم کی حیثیت سے کتابی علم اور میکانکی کام کا ایک ایسا آمیزہ تیار کرلیا جس سے ۶، ۷ سے ۱۴ سال کے لڑکے لڑکیوں کی ذہنی ورزش کا کام اچھی طرح انجام پاسکے تو کیا ہم نے سب کچھ کرلیا جو اُن کی تعلیم کے لیے کرنا ہے؟ خیر سب کچھ تو یوں بھی کوئی کبھی نہیں کرسکتا۔ لیکن ہم نے تو شاید ابھی

اپنا سب سے اہم کام نہیں کیا ہے۔ ہم نے اگر ذہنی قوتوں کو نشو و نما دینے کا انتظام کر دیا، اگر ہنر مندیاں پیدا کر دیں، تو تعلیم کا کام ختم نہیں ہوگا۔ صلاحیتیں اور ہنر مندیاں نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بُری۔ وہ اچھی اور بُری بنتی ہیں ان مقاصد سے جن کی خدمت میں لگائی جاتی ہیں۔ آپ کی عدالتوں میں جھوٹ کو سچ بنا کر روپیا بٹورنے والے، آپ کی تجارتی فرموں میں کالی منڈی کے لال سوداگر اور جماعتی محاصل کے چور، آپ کے عہدے داروں میں رشوت کا بازار گرم کرنے والے، آپ کے پبلک کام کرنے والوں میں ذاتی غرض پر عام مفاد کو چٹکی بجانے میں قربان کرنے والے، آپ کے عالموں اور پنڈتوں، آپ کے جوگیوں اور صوفیوں میں عام مخلوق کے جہل اور توہم پرستی سے بے دریغ ناجائز فائدہ اٹھانے والے، آپ کے جھوٹے گواہوں اور جعل سازوں کے بامُراد دل یہ سب، کچھ صلاحیتوں اور ذہنی مہارتوں میں کسی سے پیچھے تو نہیں ہیں۔

کیا ہم اپنے مدرسوں کو ذہنی صلاحیتوں کے چمکانے اور مہارتوں کے پیدا کرنے کا ادارہ بنا کر ان میں انہیں فوجوں کے لیے رنگروٹ حاصل کرنا چاہیں گے؟ نہیں، تعلیم مہارتوں سے نہیں ہوتی، مہارتوں کو اچھے مقاصد کا خادم بنانے سے ہوتی ہے۔ جمہوری جماعت میں اس حقیقت کو نظر انداز کرنا جماعت کی زندگی کی شرائط سے غفلت برتنا ہے۔ جب تک فرد اپنی قوتوں کو جماعت کی خدمت کے لیے صرف کرنا نہ سیکھے اس وقت تک اس کی ہنر مندی جماعت کے انتشار کا سبب بن سکتی ہے۔ اور خصوصیت سے جمہوری ریاست میں جو تحقیق و تفتیش کی آزادی ہے، جماعت کی آزادی ہے، تقریر و تحریر کی آزادی ہے، مشاغل کے انتخابات کی آزادی ہے، ان سب سے انفرادیت کی انتشاری قوتیں ابھرتی ہیں۔ جو ان آزادیوں کی قدر کرتے ہیں اور جمعیت کی خاطر انہیں ہاتھ سے دینے کو بہت گراں سودا جانتے ہیں لیکن جنہیں جماعتی زندگی کا انتشار بھی گوارا نہیں۔ انہیں ان آزادیوں کے ساتھ ساتھ جماعتی ذہن کے نشوونما اور جمعیت قومی کے استحکام کی تدبیریں بھی سوچنی چاہئیں۔ انہیں دیکھنا چاہیے کہ مدرسہ ایک جماعتی ادارے کی حیثیت سے اس باب میں ہماری کیا مدد کر سکتا ہے؟ آج تو وہ تعلیم سے انفرادیت کو کچلتا ہے اس لیے کہ سب کے واسطے وہ راہ متعین کرتا ہے جو بہت کم کی صحیح راہ ہو سکتی ہے، تعمیر اور تخلیق کے لیے بے چین بچوں کو کتابوں پر جھکاتا ہے، ان اوزاروں کی جگہ جن کی طرف بچوں کی للچائی نظریں تکتی ہیں انہیں قلم دوات دیتا ہے، اچھلنے کودنے کے لیے بے تاب

بچوں کو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک طرف تو انفرادیت کے ساتھ یہ بے اعتنائی، دوسری طرف خود غرضی کی راہوں پر انھیں چلانے کے لیے وہ اہتمام کہ الامان۔ اپنے مدرسوں کے نصاب کو، ان کے کاموں کو ذرا غور سے دیکھیے اور ان کی تحلیل کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شاید ایک ہی کاروبار ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ افراد کی ذہانت، ان کی قوتِ آزادی، ان کی ہنر مندی سب بس فرد ہی کے لیے نشوونما پائیں، جماعتی محرکات کو بروے کار آنے کا نہ موقع ملتا ہے، نہ وہ ابھرتے ہیں، نہ تربیت پاتے ہیں۔ ذہن کو بیدار کیا جاتا ہے، دل سلایا جاتا ہے۔ حقوق یاد رہتے ہیں، فرائض بھلائے جاتے ہیں۔ انفرادی غرض طلبی کی ڈھلوان شاہ راہ پر بچے دھکیلے جاتے ہیں، جماعتی بے غرضی اور خدمت کے دروازے بند رہتے ہیں۔ دوسرے کو کہنی مار کر آگے بڑھ جانے کی ہر دم مشق مہیا ہے، ساتھی کو سہارا دے کر آگے بڑھانے کا کہیں نام نہیں۔ سب اپنے اپنے لیے ہیں، سب کے لیے کوئی نہیں۔ ہاں زبان سے کبھی کبھی قومی خدمت، پڑوسی کے حقوق، باہمی تعاون کی تلقین ہوجاتی ہے۔ لیکن کرنے کے کام باتوں سے انجام نہیں پاتے۔ کردار کی عادتیں گفتار سے پختہ نہیں ہوتیں۔ زندگی سے حقیقی تعلق خیال اور احساس کے علاوہ عمل کا طالب بھی ہے۔ جماعت کے لیے اپنی صلاحیت کے مطابق کچھ خدمت انجام دینے میں اس کی نشوونما کا راز ہے۔ اچھی جماعت اپنے افراد کو اس کا موقع دیتی ہے کہ وہ مل کر اس کے لیے کچھ کریں اور اس پر خوش ہوسکیں۔ اچھا مدرسہ بھی جماعتی کام کی مشترک خوشی کے مواقع نکالتا ہے۔ کام کے کامیابی سے انجام پانے پر خوشی تو انفرادی سعی میں بھی ہوتی ہے مگر وہ جماعتی مقاصد سے بے تعلق ہوتی ہے۔ کام کی اس انفرادی مسرت کو کہ خود غرضانہ انجن ہے جماعتی مقاصد کی پٹری پر ڈال دینا چاہیے۔ انفرادی عمل کی خوشی کو جماعتی کام کی لگن اور اس پر سرور اور فخر میں بدل دینا چاہیے۔ یوں جماعت سے فرد کا تعلق فرد کے لیے وجہ مسرت و افتخار بن جاتا ہے اور فرد اور جماعت کی گتھی فلسفیانہ بحثوں کے بغیر کھل جاتی ہے۔

## تربیت کے چار اہم نکات

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشترکہ کام کی مسرت کس قسم کے کام سے حاصل ہوسکتی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ اس وقت نصیب ہوتی ہے جب کام، کام کرنے والے کی صلاحیت، اس کے رجحانات، اس کی طبیعت کے جھکاؤ کے مطابق ہوں۔ اور صاحبو! آپ سے بہتر کون جانتا ہے

کہ یہ صلاحیت کیا ہوتی ہے اور یہ جھکاؤ کدھر ہوتا ہے؟ کتابوں کی طرف ہوتا ہے یا عملی کام کی طرف۔ چنانچہ انفرادی رجحان اور قومی مصالح دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے کتابی مدرسے عملی کام کے مدرسے بن جائیں۔ اس **پہلے قدم** سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے **دوسرا قدم** یہ ضروری ہے کہ عملی کام کی انفرادی خواہش کو مشترک جماعتی کاموں میں لگانے کا انتظام کیا جائے اور مدرسے کو کام کی جمعیت کی حیثیت دے دی جائے۔ اور جب خودغرضانہ عمل کا جذبہ جماعتی خدمت میں منتقل ہو جائے، ایک نظم کے ماتحت اپنے کو لائے، دوسرے کی مدد کرنے، دوسرے سے مدد لینے کی عادت پڑنے لگے اور ذمّے داری کا احساس پیدا ہو جائے تو **تیسرا قدم** یہ ہے کہ عادتوں کو بصیرتوں میں بدلا جائے۔ اس مشترک عمل کے جماعتی محاسن اُجاگر کیے جائیں اور شخصی اور جماعتی اغراض کے ساتھ ساتھ پورا ہو سکنے کے امکانات واضح کیے جائیں۔ اور **چوتھا قدم** یہ ہے کہ متعلمین کے اکثر انتظامات خود ان کے ہاتھ میں دے دیے جائیں۔ ذمّے داری کا احساس اور اپنے کام کو اپنے بس بھر بہترین طرز پر انجام دینے کی عادت آزاد اور پیہم عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ مدرسے کی ہم آہنگ فضا میں مشفقانہ نگرانی اور مشورے کے ساتھ یہ سب منزلیں خوبی سے طے ہو سکتی ہیں اور مدرسہ اس خودمختار جمہوری ریاست کا جو اُسے چلاتی ہے سب سے مفید ادارہ بن سکتا ہے اور اس ریاست کو بہتر ریاست بنانے میں سب سے زیادہ مؤثر قوت ثابت ہو سکتا ہے۔

صاحبو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنے بنیادی مدرسوں میں یعنی اپنی قومی تعلیم کے سب سے اہم حصے میں اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو بس کرنے کی چیز یہی ہے کہ ان مدرسوں کو خبری علم کے مرکزوں کی جگہ تجربی علم کے مدرسے بنانا چاہیے، کتابوں کے مدرسے کی جگہ کام کا مدرسہ بنانا چاہیے۔ انفرادی خودغرضی کی جگہ بے غرض جماعتی خدمت کی تربیت گاہ بنانا چاہیے۔ ادبی و نظری یک طرفہ پن کی جگہ ان میں زندگی کے عملی تنوع کو جگہ دینی چاہیے۔ یہ مشکل کام ہے مگر ضروری کام۔ ہمارا مستقبل اس منصوبے کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کام میں آپ کے بہت سے مددگار ہوں گے اور اس سے زیادہ رکاوٹ ڈالنے والے۔ لیکن یہ کام انجام اسی وقت پا سکتا ہے جب اُستاد اپنے فرض کو جانیں اور تعلیم کے معاملے میں اپنے منصب کو پہچانیں۔ مجھے یقین ہے کہ 'نیو ایجوکیشن فیلوشپ' کے اراکین اس میدان میں اور سب سے آگے ہوں گے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

**Reconstruction of Curriulum in Islamic Perspective in Pakistani Universities**

# پاکستانی یورنیورسٹیوں میں نصابات کی اسلامی تشکیل نو
# ایک عملی منصوبہ

## یونیورسٹی پروفیسرز اور صدورِ شعبہ جات توجہ فرمائیں

پاکستان چونکہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اور اس کے بانی اقبالؒ اور جناحؒ کے الفاظ میں اسے نفاذ اسلام کی تجربہ گاہ بلکہ اسلام کا قلعہ اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بننا تھا، اس لیے پاکستان کے نظام تعلیم اور خصوصاً پاکستانی جامعات میں جو کام پہلے دن سے ہوجانا چاہیے تھا وہ یہ کہ علوم اور نصابات کی اسلامی تشکیل نو کی جاتی اور اسلامی تناظر میں ہر مضمون کی نئی نصابی کتب مدون کی جاتیں۔ حکومت پاکستان کو یہ کام سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر فوراً شروع کرنا چاہیے تھا۔ اسے نہ کرنے کا نتیجہ مغرب کی فکری غلامی اور ذہنی افلاس کی صورت میں نکلا ہے۔

ہم حکومت پاکستان سے (اور اب تعلیم چونکہ بدقسمتی سے ایک صوبائی معاملہ قرار دیا جاچکا ہے اس لیے صوبائی حکومتوں سے ) یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام پہلے نہیں کیا تو اب ہی شروع کردیں.... لیکن پاکستانی ریاست اور حکومتوں کے اِس وقت جو حالات ہیں اور سیکولرزم ولبرلزم کی جس منزل تک ریاست اور اس کے ادارے (بشمول فوج، عدلیہ، مقننہ، انتظامیہ سب ) پہنچ چکے ہیں، اس کے بعد ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ یہ کام کریں گے، اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کو توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ ملک کی فہیم دینی قوتیں جمع ہوں اور یہ کام خود کریں۔ لیکن دینی قوتوں کا یہ حال ہے کہ دینی سیاسی جماعتیں سوائے سیاسی جدوجہد کے اور کچھ نہیں کرتیں اور دینی مدارس اور مساجد کے علماء کرام اس کام کو سرے سے کوئی دینی مطالبہ ہی نہیں سمجھتے اور نہ یہ کام ان کے بس کا ہے۔ اس لیے لے دے کر ہماری ساری توقعات جامعات کے ان پروفیسروں اور صدورِ شعبہ جات

(وائس چانسلر حضرات سے بھی توقع کم ہے) سے وابستہ ہیں جو اپنے پروفیشن کے ساتھ ساتھ اسلامی اصول و اقدار کے علمی و عملی نفاذ کا بھی احساس رکھتے ہیں اور جیسا کہ اس وقت دنیا میں مروج ہے کہ یونیورسٹیاں اپنے علمی و فکری معاملات میں آزاد ہوتی ہیں اور پروفیسر حضرات اپنے علمی نظریات اور نصابات کی تشکیل میں بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں(HEC کی مجوزہ آؤٹ لائن کے باوجود پروفیسرز اور صدورِ شعبہ جات یونیورسٹی کی طرف سے اضافے کر سکتے ہیں) لہٰذا پروفیسر حضرات اگر چاہیں تو پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر یونیورسٹیوں میں یہ کام ہوسکتا ہے۔ اور کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر یا صدرِ شعبہ اس کا مویّد نہ ہوتو کوئی ایک پروفیسر بھی اگر جذبہ رکھتا ہوتو وہ خود جو مضمون پڑھا رہا ہو، اس میں اضافے اور کمی بیشی کرسکتا ہے اور کوشش کرے تو اپنے شعبے کو اس کام کے لیے متحرک کرسکتا ہے یا دوسری جامعات کے متعلقہ شعبے میں سے ہم خیال احباب کو ساتھ ملا کر اجتماعی جدوجہد کا پلیٹ فارم بنا کر مفید نتائج حاصل کرسکتا ہے۔

ہم یہاں یہ عرض بھی کریں کہ یہ کام بلاشبہ سکول لیول پر بھی کرنے کا ہے لیکن یونیورسٹیاں چونکہ علم و تحقیق کا مرکز ہوتی ہیں اس لیے پہلے مرحلے میں اگر یہ کام یونیورسٹی سطح پر ہوجائے تو اس کے اثرات لازماً نیچے کی طرف سفر کریں گے اور یہ کام سکول سطح پر بھی ہونے لگے گا، ان شاء اللہ۔

## کام کے تین بڑے شعبے

یونیوسٹیوں میں جو علوم اس وقت پڑھائے جا رہے ہیں ان کو ہمارے پیش نظر مقصد کے حوالے سے تین بڑے گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: عمرانی علوم، اسلامی علوم اور سائنس و ٹیکنالوجی۔ ان میں نصابات کی اسلامی تشکیل نو کے حوالے سے جو کام مطلوب ہے ہم اختصار سے یہاں اس کا ذکر کریں گے:

## عمرانی علوم

علوم کی اسلامی تشکیل کے حوالے سے یہ سب سے بڑا اور اہم گروپ ہے جو فرد اور معاشرے کی فکری تشکیل اور ذہن سازی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں زبانیں،

تعلیم، قانون، سیاسیات، اقتصادیات، نفسیات، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سماجیات (انتھروپالوجی/سوشل سٹڈیز) تجارت، بزنس، انتظامیات، ذرائع ابلاغ وغیرہ شامل ہیں۔

ان علوم میں تقریباً ۵۰ فیصد حصہ زمینی اور عصری حقائق اور علمی پیش رفت کا ہوتا ہے اور باقی پچاس فیصد اسلامی اصولوں کی روشنی میں مسائل کے حل اور تفصیلات کے تعین کا اجتہادی کام ہوتا ہے۔ ہماری رائے میں ہر عمرانی علم کے نصاب کے چار حصے ہونے چاہئیں:

ایک: متعلقہ موضوع پر ماضی کا ورثہ اور مغربی علوم کی پیش رفت

دوم: متعلقہ موضوع کے بارے میں اسلامی تعلیمات وتصورات

سوم: اسلام اور مغربی علوم کا تقابلی مطالعہ اور مغربی علوم کا اسلامی تناظر میں تنقیدی جائزہ

چہارم: متعلقہ موضوع پر عصری حوالے سے اسلامی تناظر میں نظریہ سازی، تفصیلات کا تعین اور مسائل کا حل۔

❁ یہ کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگ مل کر یہ کام کریں جنہیں متعلقہ مضمون کی عصری پیش رفت کا بھی علم ہو اور وہ اس کے اسلامی پہلوؤں پر بھی گہری نظر رکھتے ہوں۔

❁ کام کی تین سطحیں ہوں گی: ۱۔مندرجہ بالا چار اصولوں کے مطابق نصابی خاکے کی تیاری ۲۔اس موضوع پر عصری اور اسلامی حوالے سے کیے گئے کام کی نشان دہی ۳۔حسب ضرورت نئی نصابی کتب کی تدوین وتصنیف۔

## علوم اسلامیہ گروپ

اسلامی علوم کی تدریس کا طریقہ دینی مدارس میں بھی خام ہے اور یونیورسٹیوں میں بھی۔ یہاں ہم یونیورسٹیوں کے اسلامی علوم کے نصاب پر نظر ثانی کی بات کریں گے جس میں مندرجہ ذیل پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

- عربی زبان پر ماہرانہ گرفت نیز اُردو اور انگریزی پر عبور تاکہ ان زبانوں میں اسلامی علوم کے ذخائر کا مطالعہ کیا جا سکے۔

- قرآن وسنت اور ان کے علوم پر ترکیز (جو اس وقت، معاف کیجیے گا نہیں ہے)۔

۔ عصری/مغربی علوم وافکار کا تفہیمی اور تنقیدی مطالعہ

۔ اسلام اور عصر حاضر خصوصاً جدید مسائل اور عمرانی علوم میں اجتہاد، مسلم عروج وزوال پر تدبر اور امہ کو درپیش ایمانی، فکری و عملی چیلنجز کا مطالعہ۔

## سائنس وٹیکنالوجی گروپ

۱۔ سائنسی حقائق کے بیان کا ایسا اسلوب جو طالب علم کو ان حقائق کے خالق تک پہنچادے۔

۲۔ سائنس وٹیکنالوجی میں مغرب کی نقالی پر انحصار اور اکتفا نہ کرنا اور بطور End-user اپنے کردار کو قبول نہ کرنا، بلکہ اپنے فکری وتہذیبی پیراڈائم کے اندر رہتے ہوئے نئی تحقیق وابتکار پر اصرار کرنا۔

## حرفِ آخر

ہم پھر دہراتے ہیں کہ حکومت پاکستان، محکمہ تعلیم اور HEC سے اس کام کا مطالبہ کرنا کافی نہیں۔ اگر کوئی وائس چانسلر یا صدر شعبہ اس کام پر آمادہ ہوجائے تو بہت خوب ورنہ ہر شعبے کا ایک پروفیسر بھی اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو وہ اپنی یونیورسٹی یا دوسری یونیورسٹیوں کے متعلقہ شعبے کے ہم خیال افراد سے مل کر کام کی ابتداء کرسکتا ہے۔ ہم ہر اس یونیورسٹی پروفیسر سے، جس تک ہماری یہ آواز پہنچے، درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے ذکر کردہ کام کی اہمیت کا احساس کرے تو اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ اسے چاہیے کہ وہ ہم سے بھی رابطہ کرے تاکہ ہم متعلقہ احباب کے درمیان کوآرڈی نیشن کا کام کرسکیں۔

اے اللہ! لوگوں کے دل اس اہم دینی کام کے لیے کھول دے۔ آمین یاربّ العلمین. علیہ توکلت والیہ انیب. ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم.

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسین

# تربیتِ اساتذہ - مسلسل حادثوں کا شکار

ایک زمانہ تھا جب شکوہ کیا جاتا تھا کہ اساتذہ کے انتخابات میں امیدواروں کے رجحان، اُن کے شخصی رویوں اور ذاتی کردار کا خیال نہیں رکھا جاتا لیکن ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کسی حد تک تربیت اساتذہ کے عمدہ پروگراموں سے کرلیا جاتا تھا۔ اب ماشاءاللہ ترقی کی کئی منازل طے کرتے کرتے ہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اَن ٹرینڈ پروفیسروں سے پرائمری اور سیکنڈری سکولوں کے اساتذہ کی تربیت کرواتے کرواتے سول بیوروکریسی اور این جی اوز کے کارندوں تک پہنچ چکے ہیں۔ پنجاب میں ایک مشہورِ زمانہ سنٹرل ٹریننگ کالج ہوتا تھا جو بعد میں کالج آف ایجوکیشن کے نام سے موسوم ہوا اور اب یونیورسٹی آف ایجوکیشن لوئر مال لاہور کا کیمپس ہے۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن کے نام سے قائم ہونے والا نامی گرامی ادارہ تربیت اساتذہ کے سوا سب کچھ کرتا ہے۔ جونیئر ورنیکلر اور سینئر ورنیکلر یعنی جے۔ وی اور ایس وی اساتذہ کی تربیت کے لیے نارمل سکول ہوتے تھے۔ ان نارمل سکولوں میں گکھڑ، کمالیہ، شاہ پور صدر، لالہ موسیٰ، ملتان اور بہاولپور کے نارمل سکول تربیت اساتذہ کے حوالے سے شاندار ادارے تھے۔ انہیں پہلے گورنمنٹ کالجز برائے ایلیمنٹری ٹیچرز قرار دیا گیا۔ ان میں سے بعض یونیورسٹی آف ایجوکیشن کے سب کیمپس بنے اور اب سنا ہے انہیں قائداعظم انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ قرار دے دیا گیا ہے۔ کیا ان کا ایجنڈا تربیتِ اساتذہ ہے؟ نہیں! ان کا ایجنڈا تو سول بیوروکریسی کے لیے زائد آسامیاں پیدا کرنا ہے۔

۱۹۵۹ء کی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت لاہور میں دورانِ ملازمت تربیت اساتذہ کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا جس کا نام تھا ایجوکیشن ایکسٹنشن سنٹر۔ شروع میں ٹھیک چلا، بعد میں زیر انکوائری تعلیمی انتظامی افسران کے لیے ڈمپنگ گراؤنڈ (Dumping Ground) بنا دیا گیا۔ امریکیوں نے ورلڈ بینک کے توسط سے اسے ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈویلپمنٹ بنایا۔ جب سول بیوروکریسی کو اس ادارے کی افادیت کا پتہ چلا تو قبضہ کرلیا اور اب اسے بھی قائد اعظم انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ قرار دے دیا گیا ہے۔ تمتع سول بیوروکریسی کے

افسران کرتے ہیں اور تربیت اساتذہ کا کام مبینہ طور پر ملکی اور غیر ملکی این جی اوز سے کراتے ہیں۔

جو کہانی ہم نے صوبہ پنجاب کی بیان کی ہے کم وبیش یہی کہانی دیگر صوبوں کی بھی ہے۔ صوبہ خیبر پختونخواہ میں البتہ ایک جدت آمیز کام کیا گیا ہے۔ وہاں پر آٹھ 'ریجنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچر ایجوکیشن' کروڑوں کے مصارف سے قائم کیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے قرض کی رقم غالباً ورلڈ بینک نے یا ایشین ڈویلپمنٹ بنک نے مہیا کی۔ یہ ادارے عمارتوں اور سہولتوں کے لحاظ سے شاندار بنائے گئے لیکن پروفیشنل سٹاف مہیا ہی نہیں کیا گیا۔ اس لیے یہ ادارے مرحومہ تربیت اساتذہ کے شاندار مقابر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ملک کی بعض یونیورسٹیوں میں انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (IERs) بھی قائم ہیں۔ تعلیم اور تحقیق تو 'شاید' ان اداروں میں ہوتی ہوگی، رہ گئی تربیت اساتذہ یعنی سکول سطح پر تدریس کے لیے مناسب مہارتیں اور رویے تو میرے ذاتی مشاہدے کی حد تک ایسا کوئی کام وہاں نہیں ہوتا۔

تربیت اساتذہ مہیا کرنے والا غالباً سب سے بڑا ادارہ (زیر تربیت اساتذہ کی تعداد کے لحاظ سے) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی نے جہاں علم کی 'روشنی' ملک کے کونے کونے تک پہنچانے کا کام کیا ہے وہیں تربیت اساتذہ کے مقدس کام کو برباد کرنے میں بھی دوررس کردار ادا کیا ہے۔ اوپن یونیورسٹی کے پرائمری ٹیچنگ سرٹیفکیٹ (PTC) کے کورسز سے لاکھوں میٹرک پاک نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے استفادہ کیا اور پرائمری سکول ٹیچر بنے۔ اب کئی سالوں سے گریجویٹ نوجوان خواتین وحضرات لاکھوں نہیں تو ہزاروں کی تعداد میں اوپن یونیورسٹی کے بی۔ ایڈ پروگرام میں داخل ہوئے اور ڈگریاں حاصل کیں لیکن ان ڈگری ہولڈرز سے اگر پوچھیں کہ بی۔ ایڈ کس کا مخفف ہے تو اکثر آئیں بائیں کر کے منہ موڑ لیں گے۔ اوپن یونیورسٹی کے تربیت اساتذہ کے ان پروگراموں نے جعل سازی، کم کوشی اور بغیر پڑھے گریڈز اور ڈگریاں حاصل کرنے کو فروغ دیا ہے۔ ان گریجوایٹس کو سبقی اشارے کے بنیادی اجراء تک کا علم نہیں ہوتا۔ کردار، رویہ، تدریسی مہارت اور اسی طرح کے ضروری شخصی پہلو اس طرح کے صلاحی پروگراموں سے پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نے اپنے سیاسی مفادات کے لیے بھی ماضی میں تربیت اساتذہ کی تباہی میں اپنا مقدم کردار ادا کیا جب عام ہائی سکولوں میں پی ٹی سی کے یونٹ کھول کر ہزاروں نوجوانوں کو تدریسی سرٹیفکیٹ عطا کر کے سکولوں میں بھرتی کیا گیا۔ تدریسی سرٹیفکیٹ کے حامل ان نام نہاد

اساتذہ میں شاید ایسے بھی تھے جو ABC اور الف بے جیم سے بھی واقف نہیں تھے۔ اس کا مشاہدہ راقم الحروف کو دوران ملازمت تربیتی کورسز کے انعقاد اور نگرانی کے دوران ہوا۔ رحیم یار خان کے ایک تربیتی مرکز پر مجھے بتایا گیا کہ ہم تربیت کیا کریں، ان نام نہاد اساتذہ کو تو انگریزی اور اردو کے حروف تہجی پڑھانے پڑ رہے ہیں۔

ادارتی سطح پر تربیت اساتذہ کی ناقابل بیان صورتِ حال کے ذکر کے بعد ہم آتے ہیں ۵۰، ۶۰ اور کسی حد تک ۷۰ کی دہائی کے دوران تربیت اساتذہ کے نصاب اور طریق کار کی طرف۔ تربیت اساتذہ کے یہ پروگرام ہمیں انگریزی حکومت سے ورثے میں ملے تھے۔ ان پروگراموں کا ہدف سکل ڈویلپمنٹ، کریکٹر ڈویلپمنٹ اور پسندیدہ رویوں کی تشکیل ہوتا تھا۔ تربیت اساتذہ کے تمام ادارے رہائشی ہوتے تھے۔ بڑی مشکل سے کسی طالب علم کو باہر رہنے کی اجازت ملتی تھی۔ ہاسٹلز میں ڈسپلن کی سخت پابندی کرائی جاتی تھی۔ نارمل سکولوں میں دستی کام خاص طور پر کسی، کھرپہ اور درانتی سے کام پر زور دیا جاتا تھا۔ ورزش، ڈرل اور کھیلیں لازمی ہوتی تھیں۔ عملی تدریس بشکل ڈیمانسٹریشن اسباق، ڈسکشن اسباق، مشقی اسباق، حقیقی ماحول میں کرائے جاتے تھے۔ سکولوں میں ٹیچنگ پریکٹس کورس کا لازمی حصہ ہوتا تھا۔ مربی اساتذہ خود نمونے کے اسباق دیتے تھے۔ غرض ہر ہر لمحہ زور مہارتوں کی تحصیل پر ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ تربیت دینے والے اساتذہ اخلاقی بیانات اپنے لیکچرز کا مسلسل حصہ بناتے تھے۔ مجھے یاد ہے ہمارے تدریس ریاضی کے استاذ پروفیسر شمیم لودھی صاحب تقریباً اپنے ہر لیکچر میں یہ ضرور کہتے ’’دیکھو آپ ریاضی کے استاد بننے والے ہیں۔ ریاضی میں پرائیویٹ ٹیوشن بہت ملتی ہے۔ دیکھو یہ گھٹیا اور ذلیل کام نہ کرنا۔ کسی استاد کے لیے سب سے ذلیل کام ٹیوشن پڑھانا ہے۔ جب کوئی استاد پرائیویٹ ٹیویشن پڑھاتا ہے تو استاد اور شاگرد کے رشتے میں پیسہ اور مزدوری آجاتی ہے اور یہ مقدس رشتہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے‘‘۔ یہ میں نے ایک مثال دی ہے۔ تربیت اساتذہ کے اداروں میں اخلاقی تربیت پر بہت زور دیا جاتا تھا اس لیے اس دور کے پڑھے اساتذہ میں اخلاص بے غرضی اور اپنے شاگردوں کے لیے پدرانہ محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ یہ جو ہم رونا روتے ہیں کہ ماضی میں اساتذہ محبت اور شفقت کا مجسمہ ہوتے تھے اور آجکے اساتذہ مادیت اور خود غرضی میں ڈوبے ہوئے تعلیمی تاجر ہیں تو اس کی بنیادی وجہ تربیت ہے جو

انسان کے رویوں میں تبدیلی لاتی ہے۔ 'جہانِ حیرت' کے مصنف چوہدری سرداراحمد مرحوم (سابق آئی جی پولیس) نے جس ماسٹر غلام قادر کا اپنی آپ بیتی میں ذکر کیا ہے وہ کردار اب عنقا ہیں۔ پیشہ ورانہ تربیت ایک ایسا عمل ہے جس سے گزرنے کے بعد کارکن کی صلاحیتوں میں نکھار آتا ہے اوراس کی شخصیت میں اپنے پیشے سے متعلق مثبت اور کارآمد رجحانات اور رویے پیدا ہوتے ہیں۔اس کی ایک روشن مثال پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کی ہے کہ جس کی کٹھالی میں اَن گھڑ انٹرمیڈیٹ پاس نوجوان ڈالے جاتے ہیں اور ۲ سال کے بعد نظم وضبط کے پابند، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور پُروقار شخصیت کے حامل نوجوان افسر برآمد ہوتے ہیں۔ یہی حال سول سروس اکیڈمی کا ہے کہ لاابالی پن کا شکار نوجوان گریجوایٹس اس میں داخل ہوتے ہیں اور برآمد ہوتے ہوتے ان کی شخصیت میں سنجیدگی اور گردن میں سریا ٹھک چکا ہوتا ہے۔

کارِ تدریس تو بہت نازک اور سنجیدہ ترین کام ہے، اس لیے مدرسین کی تربیت بلکہ اعلیٰ تربیت از حد ضروری ہے۔ بدقسمتی سے اس پہلو کی طرف بہت کوتاہی برتی جارہی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انگریزوں سے تربیت اساتذہ کا جو ورثہ ملا تھا اس میں اسلامی اخلاق کی ترویج کا اضافہ کیا جاتا اور اس کے ذریعے تربیت اساتذہ میں پیغمبرانہ اخلاق اور اخلاص کا عکس لانے کی کوشش کی جاتی تاکہ نسل نو کی تعلیم وتربیت اسلامی خطوط پر ممکن ہوتی۔ یہ کچھ کرنے کی بجائے ہم نے جمایا تربیتی نظام بھی اکھاڑ پھینکا۔ اُسے زیادہ تر فاصلاتی تعلیم کے حوالے کر کے دیانت اور متانت سے تہی دامن کر دیا۔ کتابوں اور خلاصوں کے رٹے سے تو نہ تدریسی مہارتیں پیدا ہوتی ہیں اور نہ ہی اخلاقی صفات۔ اور جب مدرس ہی اخلاقی صفات سے تہی دامن ہوگا تو شاگرد سیرت وکردار کی دولت کہاں سے لائیں گے؟ نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ڈاکٹروں کی پیداوار بڑھی ہے لیکن مسیحاؤں کا قحط ہے۔ انجینئرز کی قوم ہر طرف پھیلی ہوئی ہے لیکن انجینئرنگ کا شاہ کار کوئی پیدا نہیں کر سکے۔ وکیل لاکھوں میں ہیں لیکن اکثر وبیشتر عدل وانصاف کے دشمن ۔ یہ سب نتیجہ ہے غیر تربیت یافتہ یا ناقص تربیت کے حامل اساتذہ کا جو اپنے شاگردوں کے تن پر علم (بشکل معلومات) مارتے ہیں جو ان کے لیے بھی اور معاشرے کے لیے بھی مارِ بود یعنی سانپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۳۳)

تعلیم

اکمل سومرو

# پاکستانی نظامِ تعلیم میں مغربی قوتوں کی دخل اندازی
# برطانوی فنڈز سے 'الف اعلان' کی تعلیمی مہم

پاکستان کے الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا میں این جی او'الف اعلان' کی تعلیمی مہم زوروں پر ہے۔'الف اعلان' کی لانچنگ 2013ء کے الیکشن سے تین مہینے پہلے ہوئی تھی اور اب پانچ سال گزر چکے ہیں۔'الف اعلان' کو وفاقی دارالحکومت اسلام آباد سے بیٹھ کرآپریٹ کیا جارہا ہے اوراس کے تحت مختلف ٹریننگ پروگرامز اور ریسرچ رپورٹس شائع ہوچکی ہیں۔ہمیں'الف اعلان' کی تعلیمی مہم پراعتراض نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر این جی اوز کے ذریعے سے یورپی ممالک پاکستان میں اپنا تعلیمی ایجنڈا کیوں نافذ کرنا چاہتے ہیں؟'الف اعلان' کو برطانیہ اپنے ادارے ڈیفیڈ کے ذریعے کیوں فنڈنگ کررہا ہےاوراس فنڈنگ کی مالیت کیا ہے؟ برطانیہ نے 2013ء میں جب پاکستان کے تعلیمی نظام کے خلاف مہم چلائی تھی تو برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف چینلز پراشتہارات چلائے گئے تھے جس پر انگریز سامراج نے 200 سال تک قبضہ کیے رکھا اورمعاشی لوٹ کھسوٹ کی۔

'الف اعلان' جتنی بھی تعلیمی رپورٹیں شائع کررہا ہے اس میں بیشتر اعداد وشمار محکمہ تعلیم سے حاصل کیے جاتے ہیں اور ان اعداد وشمار کو گرافس کی صورت میں پیش کر کے برطانوی فنڈنگ کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔محکمہ تعلیم کے سیکرٹریز، ڈپٹی سیکرٹریز، پارلیمنٹیرینز کو ٹی اے ڈی اے دیے جاتے ہیں اوراس کے عوض سرکاری ڈیٹا، جس تک عوام کی بھی رسائی نہیں ہوتی، اسے'الف اعلان' کے حوالے کردیا جاتا ہے۔'الف اعلان' یہ نہیں بتاتا کہ برطانوی سامراج نے اس خطے کے تعلیمی نظام کو برباد کیا، انگریزی زبان کے ذریعے سے ہمیں محکوم کیا گیا، یہاں کے تعلیمی نظام کو غیر پیداواری فلسفہ کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا اور پھراسی تعلیمی نظام کی مضبوطی کے لیے برطانیہ ۷۰ سال تک حکومت کی مدد کرتا رہا۔اورآج یہی برطانیہ ڈیفیڈ کے ذریعے سے یہاں کے نصاب کو کنٹرول کررہا ہے تاکہ برطانوی سامراج کی سیاہ کاریوں پر پردہ پوشی جاری رکھی جائے۔تعلیم کا مقصد صرف ملازمتیں پیدا کرنا ہواور ورکنگ کلاس کی صورت میں سماج کی

اشرافیہ کلاس کے تابعداروں کی فوج تیار ہوتی رہے۔ برطانیہ یو کے ایڈ اور ڈیفیڈ کے پراجیکٹس کے تحت پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو فنانس کر رہا ہے اور یہ فاؤنڈیشن پرائیویٹ سکولوں کا نیٹ ورک چلانے والوں کو فنڈنگ کرتی ہے یعنی برطانیہ پاکستان میں فنڈنگ پرائیویٹ اداروں اور الف اعلان جیسی این جی او کو کرتا ہے اور سوالات واعتراضات اپنی اس طفیلی این جی او کے ذریعے سرکاری اداروں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اگر برطانوی سرکار اتنی ہی مخلص اور سنجیدہ ہے تو پھر یہ فنڈنگ براہ راست پبلک سکولوں پر لگائے۔ پاکستان کے سرکاری سکولوں میں اگر سہولیات کا فقدان ہے تو اس پر ورلڈ بنک، آئی ایم ایف اور یورپی حکومتیں براہ راست پاکستان کی حکومت کو تعلیمی امداد کیوں فراہم نہیں کرتیں؟ پھر عالمی مالیاتی ادارے پاکستان میں معاشی اصلاحاتی ایجنڈے کے نام پر اربوں ڈالرز کی فنڈنگ کرتے ہیں جس میں سڑکیں بنائی جاتی ہیں تو معاشی ایجنڈے میں تعلیمی اصلاحات کو کیوں شامل نہیں کیا جاتا؟

'الف اعلان' کو اگر پاکستان میں برطانوی فنڈنگ سے اپنا تعلیمی کام جاری رکھنا ہے تو پھر اسے امداد کے تمام ذرائع کو واضح کرنا چاہیے ورنہ ہر الیکشن سے پہلے تعلیم کے نام پر مہم چلانے کا یہ دھندا بند کر دیا جائے۔ 'الف اعلان' دعویٰ کرتی ہے کہ وہ این جی او نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ این جی او نہیں ہے تو پھر کس بلا کا نام ہے؟

---

## بقیہ: تربیتِ اساتذہ - مسلسل حادثوں کا شکار

ان میں کچھ دفتروں میں براجمان ہوتے ہیں تو کچھ ہسپتالوں میں۔ کچھ مقدس ایوانوں میں نظر آتے ہیں تو کچھ عدالتوں میں، جہاں عوام الناس ہر روز ڈسے جاتے ہیں لیکن کوئی یہ سوچنے پر تیار نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

مَیں اپنے اکثر مضامین میں آخر میں یہ کہتا ہوں کہ جو صورتِ حال پیش کی گئی ہے اس کی اصلاح کے لیے کیا کیا جائے؟ لیکن تربیت اساتذہ کی تباہی اس سطح تک پہنچ چکی ہے اور فیصلہ سازوں کی شکل میں دشمن قوتیں اتنی مضبوط ہیں کہ فی الحال کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کے شعبہ میں سب کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔ نصاب بھی، کتاب بھی اور سب سے بڑھ کر وہ ذہن اور وہ ہاتھ جو فیصلے کرتا ہے اور جس کا ہر فیصلہ انٹی ایجوکیشن (Anti Education) اقدامات پر مبنی ہوتا ہے۔

تربیت

ڈاکٹر عبدالکریم بکار[۱]

# بچوں کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟
## والدین کے لیے لائحہ عمل

والدین کو اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیے کہ درس گاہیں ان کی اولاد کو اچھا شہری اور مسلمان بنائیں گی بلکہ انہیں خود اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہوگا کہ وہ اپنے بچوں کو معاشرے کا ذمہ دار فرد اور اچھا مسلمان بنائیں۔ اس کے لیے والدین گھروں میں کچھ ایسے ہلکے پھلکے قواعد وضوابط بنا سکتے ہیں جن پر عمل کر کے بچوں کے کردار میں پختگی آئے اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو۔ اس ضمن میں لائحہ عمل بنانے کے لیے کچھ نکات پیش خدمت ہیں: والدین ان میں سے جن کو مناسب سمجھیں اختیار کرلیں یا ان میں حسب ضرورت وخواہش ترمیم واضافہ کرلیں۔

۱۔ گھر کا ہر فرد نماز وقت پر ادا کرے گا۔

۲۔ ’شکریہ‘ اور ’جزاک اللہ‘ کے الفاظ گھر کا ہر فرد ادا کرے گا۔

۳۔ مار پٹائی، گالم گلوچ یا لعن طعن نہیں ہوگی۔

۴۔ اپنے محسوسات اور خیالات ادب واحترام کے ساتھ بتائیے۔

۵۔ جو جس چیز کو (دروازہ، کھڑکی، الماری) کھولے گا اُسے بند بھی کرے گا۔ کچھ گر جائے تو اُسے خود اٹھائے گا اور صاف کر کے رکھے گا۔

۶۔ آپ کا کمرہ خالص آپ کی ذمہ داری ہے۔

۷۔ بات ٹوکے بغیر سنی جائے گی اور درمیان میں اسے کوئی نہیں ٹوکے گا۔

۸۔ کوئی دو افراد دوسروں کے سامنے اتنے دھیمے لہجہ میں گفتگو نہیں کریں گے کہ کوئی اور سن نہ سکے۔

۹۔ گھر کے بزرگ اور والدین کوئی مشورہ یا حکم دیں تو اسے ماننا ہوگا۔

۱۰۔ گھر میں ہر فرد دوسروں کو سلام کرے گا۔

۱۱۔ گھر کا ہر فرد روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرے گا۔ بچوں کو قرآن حکیم کی کچھ

---

[۱] شامی پروفیسر اور مصنف

سورتیں یاد کروا دینا بہت مفید ہے۔

۱۲۔ جو ملنے آئے وہ ان گھریلو ضوابط کا احترام کرے۔

۱۳۔ گھر کا کوئی بھی فرد اپنے کمرے میں کچھ نہیں کھائے گا (کھانے کے کمرے میں سب مل بیٹھ کر کھائیں)۔

۱۴۔ رات کو ۱۰ بجے کے بعد کوئی نہیں جاگے گا۔

۱۵۔ فجر سے پہلے ہر بچے اور بڑے کو نماز کے لیے جاگنا ہوگا۔

۱۶۔ موبائل فون، لیپ ٹاپ، کمپیوٹر وغیرہ صبح ۹ بجے سے رات ۹ بجے تک استعمال کی جا سکتی ہیں۔اور ۱۵ منٹ کے مسلسل استعمال کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ ضروری ہوگا۔

۱۷۔ والدین کا احترام ضروری ہوگا۔

۱۸۔ مل کر بیٹھنے کا وقت طے کیا جائے اس دوران موبائل یا لیپ ٹاپ وغیرہ کا استعمال منع ہوگا۔

۱۹۔ کھانے کے وقت سب کی حاضری اور شمولیت ضروری ہوگی۔

۲۰۔ رات ۱۰ بجے کے بعد کسی تعلیمی سرگرمی کی اجازت نہیں ہوگی۔

۲۱۔ گھر کے افراد گھر اور گھر میں موجود ہر شئے کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

۲۲۔ اپنا کام ہر کوئی خود کرے گا، دوسروں پر حکم نہیں چلائے گا، البتہ گھر کے سربراہان اپنا کام کسی کو کہہ سکتے ہیں۔

۲۳۔ خاندان کی ضروریات کسی دوسری ضرورت پر مقدم ہوں گی۔

۲۴۔ کسی کے کمرے یا علیحدگی والی جگہ پر دروازہ کھٹکھٹائے یا اس کی اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوگا۔

۲۵۔ مہمان کے آنے پر اسے خوش آمدید کہا جائے۔

۲۶۔ مہمان کی خاطر مدارات کی جائے کیونکہ مہمان کے سامنے پیش کی جانے والی چیزوں کا اللہ کے ہاں حساب نہ ہوگا۔مہمان اپنے ساتھ اللہ کی رحمت لاتا ہے۔

اس مضمون کو اہمیت دیں اور ان تجاویز کو ہلکا نہ سمجھیں کیونکہ اولاد کی تربیت ایک مشکل کام ہے جسے ہفتے کے سات دن اور دن کے چوبیس گھنٹے کرنا ہے۔لہٰذا اس سے غفلت مہلک ہے۔

ترکیۂ نفس مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

# علماء و مصلحین کے فتنے اور خرابیاں

سب سے بڑا صدمہ اس بات کا ہے کہ علماء و مصلحین میں جو فتنے آج کل رونما ہو رہے ہیں، نہایت خطرناک ہیں۔ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن فہرست کے درجہ میں چند باتوں کا ذکر ناگزیر ہے:

## ا۔ مصلحت اندیشی کا فتنہ

یہ فتنہ آج کل خوب برگ و بار لا رہا ہے۔ کوئی دینی یا علمی خدمت کی جائے اس میں پیشِ نظر دنیاوی مصالح رہتے ہیں۔ اس فتنہ کی بنیاد نفاق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی دینی و علمی خدمات برکت سے خالی ہیں۔

## ۲۔ ہردلعزیزی کا فتنہ

جو بات کہی جاتی ہے، اس میں یہ خیال رہتا ہے کہ کوئی بھی ناراض نہ ہو، سب خوش رہیں۔ اس فتنہ کی اساس حبّ جاہ ہے۔

## ۳۔ اپنی رائے پر جمود و اصرار

اپنی بات کو صحیح و صواب اور قطعی و یقینی سمجھنا اور دوسروں کی بات کو درخور اعتناء اور لائق التفات نہ سمجھنا' اور یہی یقین کرنا کہ میرا موقف سو فیصد حق اور درست ہے اور دوسرے کی رائے سو فیصد غلط اور باطل ہے۔ یہ اعجاب بالرائے کا فتنہ ہے اور آج کل [دینی] سیاسی جماعتیں اس مرض کا شکار ہیں۔ کوئی جماعت دوسرے کی بات سننا گوارا نہیں کرتی، نہ حق دیتی ہے کہ ممکن ہے کہ مخالف کی رائے کسی درجہ میں صحیح ہو یا یہ کہ شاید وہ بھی یہی چاہتے ہوں جو ہم چاہتے ہیں صرف تعبیر اور عنوان کا فرق ہو یا الاہم فالاہم کی تعیین کا اختلاف ہو۔

## ۴۔ سوءِ ظن کا فتنہ

ہر شخص یا ہر جماعت کا خیال یہ ہے کہ ہماری جماعت کا ہر فرد مخلص ہے اور اس کی نیت بخیر

ہے اور باقی تمام جماعتیں جو ہماری جماعت سے اتفاق نہیں رکھتیں وہ سب خودغرض ہیں، ان کی نیت صحیح نہیں بلکہ اغراض پر مبنی ہے۔ اس کا منشاء بھی عجب و کبر ہے۔

### ۵۔ سوءِ فہم کا فتنہ

کوئی شخص کسی مخالف کی بات جب سن لیتا ہے تو فوراً اسے اپنا مخالف سمجھ کر اس سے نہ صرف نفرت کا اظہار کرتا ہے بلکہ مکروہ انداز میں اس کی تردید فرض سمجھی جاتی ہے۔ مخالف کی ایک ایسی بات میں جس کے کئی محمل اور مختلف توجیہات ہوسکتی ہوں وہی توجیہ اختیار کریں گے جس میں اس کی تحقیر و تذلیل ہو۔ کیا [illegible] (یقیناً بعض گمان گناہ ہیں) اور [illegible] (بدگمانی سے بچا کرو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے اور بڑے بڑے جھوٹ اسی سے پیدا ہوتے ہیں) کی نصوص مرفوع العمل ہوچکی ہیں؟

### ۶۔ بہتان طرازی کا فتنہ

مخالفین کی تذلیل و تحقیر کرنا اور بلا سند ان کی طرف گھناؤنی باتیں منسوب کرنا۔ اگر کسی مخالف کی بات ذرا بھی کسی نے نقل کردی، بلاتحقیق اس پر یقین کرلینا اور مزے لے لے کر محافل و مجالس کی زینت بنانا۔ بالفرض اگر خود بہتان طرازی نہ بھی کریں، دوسروں کی سنی سنائی باتوں کو بلاتحقیق صحیح سمجھنا، کیا یہ نص قرآنی [illegible] (اگر آئے تمہارے پاس کوئی گناہ گار خبر لے کر تو تحقیق کرلو) کے خلاف نہیں؟

### ۷۔ جذبۂ انتقام کا فتنہ

کسی شخص کو کسی شخص سے عداوت و نفرت یا بدگمانی ہے لیکن خاموش رہتا ہے لیکن جب ذرا اقتدار مل جاتا ہے، طاقت آجاتی ہے تو پھر خاموشی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ گویا یہ خاموشی معافی اور درگزر کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ بیچارگی و ناتوانی اور کمزوری کی وجہ سے تھی۔ جب طاقت آگئی تو انتقام لینا شروع کیا، رحم و کرم اور عفو درگذر سب ختم۔

### ۸۔ حب شہرت کا فتنہ

کوئی دینی یا علمی یا سیاسی کام کیا جائے، آرزو یہی ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ داد ملے

اور تحسین وآفرین کے نعرے بلند ہوں، درحقیقت اخلاص کی کمی یا فقدان سے اور خودنمائی وریاکاری کی خواہش سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔صحیح کام کرنے والوں میں یہ مرض پیدا ہوگیا تو درحقیقت یہ شرکِ خفی ہے۔حق تعالیٰ کے دربار میں کسی دینی یا علمی خدمت کا وزن اخلاص سے ہی بڑھتا ہے اور یہی تمام اعمال میں عنداللہ قبولیت کا معیار ہے۔ اخبارات، جلسے، جلوس، دورے زیادہ تر اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

## ۹۔خطابت یا تقریر کا فتنہ

یہ فتنہ عام ہوتا جارہا ہے کہ لن ترانیاں انتہا درجہ میں ہوں، عملی کام صفر کے درجہ میں ہوں‘ قوالی کا شوق دامن گیر ہے، عمل وکردار سے زیادہ واسطہ نہیں۔ Z Z ZpbYZ Zy rF Ly AnonEj Ø تَفْعَلُوْنَ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾ یعنی کیوں کہتے ہومنہ سے جونہیں کرتے‘ بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو۔(ترجمہ شیخ الہند)، خطیب اس انداز سے تقریر کرتا ہے گویا تمام جہاں کا درد اس کے دل میں ہے لیکن جب عملی زندگی سے نسبت دیکھی جائے تو درجہ صفر ہوتا ہے۔

## ۱۰۔پروپیگنڈا کا فتنہ

جو جماعتیں وجود میں آئی ہیں، خصوصاً [دینی] سیاسی جماعتیں ان میں غلط پروپیگنڈہ اور واقعات کے خلاف جوڑتوڑ کی وبا اتنی پھیل گئی ہے جس میں نہ دین ہے اور نہ اخلاق، نہ عقل ہے نہ انصاف، محض یورپ کی دین باختہ تہذیب کی نقالی ہے۔اخبارات، اشتہارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن تمام اس کے مظاہر ہیں۔

## ۱۱۔مجلس سازی کا فتنہ

چند اشخاص کسی بات پر متفق ہوگئے یا کسی جماعت سے اختلاف رائے ہوگیا، فوراً اخبار نکالا جاتا ہے، بیانات چھپتے ہیں کہ اسلام اور ملک بس ہماری جماعت کے دم قدم سے باقی رہ سکتا ہے۔نہایت دل کش عنوانات اور جاذبِ نظر الفاظ وکلمات سے قرار دادیں اور تجویزیں چھپنے لگتی ہیں، امت میں تفرق وانتشار اور گروہ بندی کی آفت اسی راستے سے آئی ہے۔

## ۱۲۔عصبیت جاہلیت کا فتنہ

اپنی پارٹی کی ہر بات خواہ وہ کیسی ہی غلط ہو، اس کی حمایت وتائید کی جاتی ہے اور مخالف کی ہر بات پر تنقید کرنا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا ہے۔ مدعیٔ اسلام جماعتوں کے اخبارات وجرائد وتصویریں، کارٹون، سینما کے اشتہار، سود اور قمار کے اشتہار اور گندے مضامین شائع کرتے ہیں، مگر چونکہ "اپنی جماعت" کے حامی ہیں، اس لیے جاہلی تعصب کی بنا پر ان سب کو بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے۔ الغرض جو اپنا حامی ہو وہ تمام بدکرداریوں کے باوجود پکا مسلمان ہے اور جو اپنا مخالف ہو اس کے نماز روزہ کا بھی مذاق اڑایا جاتا ہے۔

## ۱۳۔حُبّ مال کا فتنہ

حدیث میں تو آیا ہے کہ ţûƆō i ì3 "/ LĜǽVøMP (یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے)۔ حقیقت میں تمام فتنوں کا قدر مشترک حب جاہ یا حبّ مال ہے۔ بہت سے حضرات ţ Ø ± LĜǽVø ĒĠŃĵ ĽŃŃ کو دنیا کی جستجو اور محبت کے لئے دلیل بناتے ہیں، حالانکہ بات واضح ہے کہ ایک ہے دنیا سے تعلق اور ضروریات کا حصول، اس سے انکار نہیں۔ نیز ایک ہے طبعی محبت، جو مال اور آسائش سے ہوتی ہے، اس سے بھی انکار نہیں۔ مقصد تو یہ ہے کہ حبّ دنیا یا حبّ مال کا اتنا غلبہ نہ ہو کہ شریعت محمدیہ اور دین اسلام کے تمام تقاضے ختم یا مغلوب ہو جائیں۔ اقتصاد واعتدال کی ضرورت ہے۔ عوام سے شکایت کیا کی جائے، آج کل عوام سے یہ فتنہ گزر کر خواص کے قلوب میں بھی آ رہا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اس فتنے کی تفصیلات کے لیے ایک طویل مقالے کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔ ہم ان مختصر اشاروں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کی ایک دعا پر ختم کرتے ہیں:

j bÿø[g ,øpžMţ i ŹÙMPDg ĥǭ k ý MPDg ĥŧ pžçľ/"ǧ bÿø

ما رزقتنی مما احب فاجعله قوة فیما تحب وما زویتَ عنی مما احب فاجعله فراغًا لی فیما تحب. اللّٰهم اجعل حبك احب الاشیاء الیّ من نفسی

تزکیۂ نفس

ڈاکٹر محمد امین

# عصرِ حاضر میں تزکیۂ نفس

## تصوف کی اصلاح اور تربیت گاہ کے نئے ماڈل کی ضرورت

### تصوف

تصوف وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں نے تزکیۂ نفس کے لیے قائم کیا۔ اس کے مؤسسین (جیسے حضرت حسن بصریؒ، ثابت بنانیؒ وغیرہ) دین کے مستند عالم اور پابند شریعت تھے اور ان کی ساری سرگرمیاں شفاف دینی تعلیمات پر مبنی تھیں۔ مسلمانوں نے اس ادارے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی زندگیوں میں اس ادارے کی وجہ سے انقلاب آیا اور وہ پھر سے اسلامی تعلیمات پر دل وجان سے عمل کرنے لگے۔

مرورِ زمانہ سے مسلمانوں کے مختلف شعبہ ہائے حیات میں تغیر آیا، وہ پہلے کمزور اور پھر زوال پذیر ہوئے اور اس کمزوری اور زوال کا بنیادی سبب احکام شریعت سے عدم وابستگی یا ان پر کماحقہ مطلوبہ جذبے کے ساتھ عمل نہ کرنا یا تصورات اور اداروں میں انحراف واقع ہوجانا تھا چنانچہ تصوف کا شعبہ بھی زوال سے دوچار ہوا اور اس میں بہت سے غیر اسلامی افکار واقدار راہ پاگئیں اور غیر شرعی رسوم ورواج اس کا حصہ بن گئے۔

اکثر صوفیہ ایسے تھے جن کے پیش نظر ہمیشہ تربیت وتزکیہ رہا اور یہی ان کی دلچسپی اور فکر وعمل کا موضوع تھا لیکن ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن پر دین کا فلسفیانہ پہلو غالب آگیا۔ وہ دوسری تہذیبوں اور قوموں کے افکار سے بھی متاثر ہوئے اور ان میں وحدۃ الوجود، حلول اور اشراق جیسے تصورات راہ پاگئے۔

### تصوف میں در آنے والی خرابیاں

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جب تصوف کی ابتداء ہوئی تو اس کا کام تھا، نام نہ تھا۔ پھر نام آیا اور کام بھی ہوا۔ پھر مرورِ وقت سے نام رہ گیا اور کام ختم ہوگیا اور آج ہمارے زمانے میں یہ حال ہے کہ نہ نام رہا اور نہ کام۔ یعنی ایسے علماء اور سکالرز بھی ہیں جو تصوف کو متوازی دین یا کم

از کم گمراہی ضرور سمجھتے ہیں اور اس کے نام اور اصطلاح سے ہی الرجک ہیں۔ اور دوسری طرف اس کے نام لیوا ایسے بھی ہیں، بلکہ اکثریت انہی کی ہے، جن کو اس کے نام کا پتا ہے کام کا نہیں۔ اس افراط وتفریط سے قطع نظر، آیئے دیکھتے ہیں کہ اس وقت تصوف کے ادارے میں کیا خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں جن کی وجہ سے یہ ادارہ اصلاح وتزکیۂ نفس کا کام موٴثر طور پر نہیں کر پا رہا:

۱۔ تصوف کے داعی اکثر صوفی اور پیر جاہل ہیں۔ دین کا مستند عالم ہونا تو درکنار ان میں سے بہت سے دین کی مبادیات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔

۲۔ اس طرح کے اکثر صوفی اور پیر خود دینی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے تو وہ اپنے مریدوں کو اچھا مسلمان کیسے بنا سکتے ہیں؟

۳۔ آج کل بہت سے صوفی اور پیر خود اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہیں مثلاً ریا کاری، دھوکہ دہی، لالچ، حبّ مال وحبّ جاہ کے مریض اور ان میں سے بعض نظر باز اور زانی۔

۴۔ کئی صوفیوں اور پیروں نے اسے خاندانی کاروبار بنا رکھا ہے یا ان کے آبا واجداد میں کوئی بزرگ گزرا تھا تو یہ اس کا نام بیچ رہے ہیں۔ اس کے گدی نشین بنے ہوئے ہیں اور باپ کے بعد بیٹا اس کاروبار کو چلاتا ہے۔

۵۔ بعض لوگوں نے اسے دولت کے ساتھ دنیاوی وجاہت وسیاست کا حیلہ بنا رکھا ہے یعنی وہ اپنے مریدوں کے ووٹوں کی بنیاد پر اسمبلیوں کے ممبر اور وزیر بنتے ہیں۔ ان کی طاقت کا منبع کسی بزرگ کا سجادہ نشین اور گدی نشین ہونا ہوتا ہے ورنہ ان میں نہ کوئی بڑی دنیاوی قابلیت پائی جاتی ہے اور نہ ان میں دین داری پائی جاتی ہے بلکہ شاید وہ جانتے ہی نہیں کہ تزکیۂ نفس کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے؟

۶۔ یہ صحیح ہے کہ تصوف میں سارے لوگ ہی ایسے نہیں ان میں بعض اچھے لوگ بھی ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو عالم ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن کے پیش نظر تزکیہ ہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں میں بھی بعض خامیاں پائی جاتی ہیں مثلاً:

- یہ اپنے فقہی اور کلامی مسلک میں رنگے ہوتے ہیں یعنی ان میں بھی دیوبندی یا بریلوی یا اہل حدیث ہونے کی عصبیت پائی جاتی ہے۔ بعض میں صوفیانہ مسلک کی عصبیت بھی

پائی جاتی ہے مثلاً وہ '' نقشبندی'' ہیں تو صرف اپنے مسلک ہی کو صحیح اور قابل عمل سمجھتے ہیں، دوسروں کی تحقیر کرتے ہیں یا انہیں لاشئے سمجھتے ہیں۔

- وہ متاخرین صوفیاء کے تصوف کو (جس میں بہت سے غیر اسلامی رسوم ورواج داخل ہو چکے ہیں) عین اسلامی گردانتے ہیں اور اس سے ہٹنے پر تیار نہیں ہوتے یا انہوں نے مباحات کو فرض وواجب کا درجہ دے رکھا ہوتا ہے۔

- ان میں سے بعض اپنے کام کو دین کا روحانی یا باطنی پہلو گردانتے ہیں اور تصوف وتزکیہ کو نہ ماننے والوں کو، خواہ وہ دین پر عامل ہی کیوں نہ ہوں، ظاہر پرست کہہ کر ان کی تحقیر کرتے ہیں۔

۷۔ اگرچہ دنیا کبھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوتی اور نہ اب ہے لیکن ایسے مربی ومزکی بہت کم ملتے ہیں جن میں مربی ومزکی ہونے کی اسلامی صفات پائی جاتی ہوں اور وہ مروجہ تصوف کی خرابیوں سے بھی بچے ہوئے ہوں خصوصاً جو پیسے نہ لیتے ہوں، زیادہ تعظیم نہ کرواتے ہوں، تزکیے کی اسلامی روایت سے بخوبی واقف ہوں، عصر جدید کے علوم ومعارف سے آگاہی رکھتے ہوں اور جدید آدمی کے مائنڈ سیٹ سے بخوبی واقف ہوں۔

## تزکیۂ نفس کی مختلف سطحیں

تزکیہ نفس کی صرف وہی ایک سطح نہیں ہے جو آج کل ہمارے معاشرے میں مروج ہے اور جو عوامی سطح کی پیری مریدی ہے بلکہ یہ کام کئی سطحوں پر کیا جاسکتا ہے اور عصری ضرورتوں کے پیش نظر ہونا بھی چاہیے جیسے:

۱۔ بڑوں (Grown ups) کے لیے تزکیۂ نفس کے ساتھ ساتھ نسل نو کی تربیت اور تزکیہ بھی ضروری ہے جس کی طرف بدقسمتی سے کسی کی توجہ نہیں، نہ صوفیوں کی، نہ تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی، اور نہ گھروں میں والدین کی حالانکہ اس کے لیے خصوصی کوششوں کی ضرورت ہے۔

۲۔ اگر تزکیے کا وسیع تر مفہوم سامنے رکھا جائے تو اشرافیہ اور خواص کے تزکیہ کا بھی ہمارے ہاں انتظام نہیں۔ تزکیے کا وسیع تر مفہوم یہ ہے کہ نفس انسانی کی ایسی تربیت جس میں

ترکِ رذائل اور اکتساب فضائل سے کام لیتے ہوئے اس کی کارکردگی اپنی معراج کو پہنچ جائے مثلاً ارکان پارلیمنٹ کی ایسی تربیت کہ وہ قانون سازی کا کام اسلامی تناظر میں اور اسلامی مقاصد کے لیے احسن انداز میں کرسکیں۔ یا مثلاً اطباء اور ڈاکٹروں کی ایسی تربیت کہ ان کے پیشِ نظر لوگوں سے ہمدردی اور لوگوں کے دکھ درد دُور کرنا اور اُن کی صحت مندی میں تعمیری کردار ادا کرنا ہو۔ دوسرے شعبوں کو بھی اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ علماء کرام اور دینی رہنماؤں کی تربیت اور تزکیہ جس کے لیے خصوصی منہج کی ضرورت ہوگی۔

۴۔ ایسے لوگوں کی تربیت اور تزکیہ جو تصوف کی مذمت کرتے ہیں اور اُسے بے دینی اور گمراہی بلکہ متوازی دین قرار دیتے ہیں۔ ان کے تزکیہ سے مراد ہے اُن کا فکری تزکیہ کرنا۔

## تصوف کی اصلاح

اگر ہم اُن خرابیوں سے بچنے کی کوشش کریں جو ماضی میں تصوف کے دائرہ میں دخل ہوئیں اور آج کے حالات کو بھی پیشِ نظر رکھیں تو کہا جاسکتا ہے کہ آج کسی ایسے آدمی کو ہی دوسروں کی اصلاح کی اجازت ہونی چاہیے جس میں مندرجہ خوبیاں ہوں:

۱۔ وہ دین کا عالم ہو۔

۲۔ وہ لوگوں سے غیر ضروری تعظیم نہ کروائے۔

۳۔ وہ لوگوں سے مال و دولت قبول نہ کرے۔

۴۔ وہ محقق صوفیاء کے مناہج تربیت میں درک رکھتا ہو۔

۵۔ وہ ماضی میں تصوف میں داخل ہونے والی غیر اسلامی رسوم و رواج کو ردّ کرتا ہو۔

۶۔ اس نے لوگوں کی اصلاح کرنے کی باقاعدہ استاد سے تربیت حاصل کر رکھی ہو۔

۷۔ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جدید تعلیم یافتہ یا ہو اور اُس نے جدید علم النفس، فلسفہ اور دیگر علوم پڑھ رکھے ہوں۔

۸۔ وہ مسلم معاشرہ پر عصر جدید کے اثرات اور آج کے انسان کے Mind set سے بخوبی واقف ہو۔

جس شخص میں یہ خوبیاں نہ ہوں اُسے تزکیۂ نفس کا نازک کام نہیں کرنا چاہیے ورنہ یہ نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم صوفی خطرہ ایمان والی بات ہوگی۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہماری ان تجاویز پر کون عمل کرے گا اور کروائے گا؟ حکمران اگر مسلمان ہوں اور دین کی حفاظت اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں تو یہ ان کا کام ہے اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس قسم کی پابندیاں بروئے کار لائیں۔ لیکن جس طرح کے ہمارے حکمران ہیں ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ یہ کام کریں گے بلکہ ان کے مغرب پرستانہ اور سیکولر رجحان کے پیش نظر یہ ذمہ داری ان کو سونپنی ہی نہیں چاہیے۔ البتہ بزرگ علماء اور صوفیاء میں سے جن لوگوں کو اس ناگوار صورت حال کا احساس ہو، انہیں چاہیے کہ وہ اصلاح کی تحریک چلائیں اور عوام کے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ وہ نااہل صوفیوں سے اپنے ایمان کو بچائیں۔

## نئی طرز کی تربیت گاہوں کا قیام

مؤثر اصلاح کے لیے تصوف کے موجودہ طریقوں کی اصلاح ہی کافی نہیں بلکہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ماضی کے تجربات اور عصری ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاح نفوس اور تربیت افراد کا نیا منہج وضع کیا جائے۔ اور اگر بعض لوگ تصوف اور اُس کی اصطلاحات سے الرجک ہوں تو ان کے ترک کرنے میں بھی کوئی ہرج نہیں (اگرچہ یہ حساسیّت اور مطالبہ کوئی ایسا وزن بھی نہیں رکھتا کیونکہ جو ادارے مسلم معاشرے میں صدیوں سے قائم ہوں اور معروف ہوں محض ان کے نام کی مخالفت ٹھیک نہیں)۔ اسی لیے ہم نے بطورِ احتیاط 'جدید خانقاہ' کی بجائے 'جدید تربیت گاہ' کی بات کی ہے۔ گویا ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ لوگوں کے تزکیہ نفوس کے لیے جدید طرز کی اور نئے ماڈل کی تربیت گاہیں قائم کی جائیں جو اس وقت کہیں موجود نہیں۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۴۸)

میڈیا

پرفیسر عاصم حفیظ

# سوشل میڈیا پر فحش اشتہارات اور جنسی کھلونوں کی تشہیر

ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے سوشل میڈیا کو ہماری زندگی کا لازمی حصہ بنا دیا ہے۔ یہ اب کوئی تفریح نہیں بلکہ ضرورت بنتا جا رہا ہے۔ کاروبار، معلومات حتی کے بعض ادارے اپنی آفیشل سرگرمیاں سوشل میڈیا کی زینت بناتے ہیں۔ سیاسی اور دینی جماعتیں سرگرم سوشل میڈیا نیٹ ورکس بنا چکی ہیں۔ ہر شعبۂ زندگی کی شخصیات اب سوشل میڈیا کے ذریعے بڑے پیمانے پر لوگوں سے رابطے کی کوشش کرتی ہیں۔ یقیناً اس میں ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ دینی معلومات، کاروباری مقاصد، روزگار کا حصول اور اپنے نظریات کا پھیلاؤ۔ سوشل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں آپ ہر نظریے اور سوچ کے تحت ایڈ جسٹ ہو سکتے ہیں اور اپنی مرضی کے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں اس کے ساتھ چلنا ہے اس سے چھٹکارہ ممکن نہیں، اس سے دور نہیں رہا جا سکتا۔

میرا موضوع سوشل میڈیا پر ہماری مرضی کے بغیر آ جانے والے اشتہارات ہیں۔ دو بڑے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز فیس بک اور یوٹیوب کے علاوہ دیگر ویب سائٹس اور نیٹ ورکس پر فحش ترین اشتہارات کی بھرمار ہے۔ مختلف تجارتی ادارے ان سوشل میڈیا ویب سائٹس کو رقم ادا کر کے اپنے اشتہارات دیتے ہیں۔ دراصل ان کا مقصد لوگوں کو اپنی مخصوص ویب سائٹ کی طرف لانا ہوتا ہے جہاں آن لائن چیزوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے جو انتہائی گھٹیا حرکت کی جاتی ہے وہ خواتین کی فحش تصاویر کے ساتھ ان سے متعلقہ کسی چیز کا اشتہار ہوتا ہے۔ آپ فیس بک استعمال کرتے ہیں تو ٹائم لائن پر چند پوسٹوں کے بعد آپ کے سامنے ایسے اشتہارات ضرور آ جاتے ہیں حتی کہ جنسی کھلونوں کے اشتہارات کی بہتات ہے۔ آپ یقین نہیں مانیں گے لیکن ایک افریقی ملک نے با قاعدہ اس حوالے سے قانون سازی کی ہے کیونکہ ان کے ہاں یہ کھلونے اس قدر مقبول ہو چکے ہیں کہ کوئی بھی نوجوان شادی کرنے کو تیار نہیں یا شاید اس کے قابل نہیں۔ یہ اب بآسانی دستیاب ہیں اور اکثر اشتہارات ان ہی کے ہوتے ہیں۔ ان کی واضح اور نمایاں تصاویر کے ساتھ اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔ کوئی بھی باشعور انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ اس رجحان کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

ہمارے ہاں کچھ عرصہ قبل تک اس قسم کی خرید وفروخت کا تصور بھی نہ تھا لیکن آن لائن شاپنگ نے اس کو انتہائی آسان بنا دیا ہے۔ فحش تصاویر کے ساتھ ان کے اشتہارات سوشل میڈیا و یب سائٹس پر دستیاب ہیں۔ جنسی صحت سے متعلق ادویات بغیر کسی قانون وضابطے کے فروخت ہورہی ہیں۔ کسی بھی ادارے کے چیک اینڈ بیلنس کے بغیر ان ادویات کے استعمال سے کتنے انسان موذی بیماریوں کا شکار بننے کے ساتھ ساتھ بہت سے جان کی بازی ہار رہے ہیں۔ وسائل کے ضیاع اور انسانی جانوں کے اس قتل عام کے بارے کسی کو احساس تک نہیں۔ اسی طرح جنسی کھلونوں کی مقبولیت آنے والے عرصے میں کیا گل کھلائے گی، کوئی بھی اس کے بارے میں سوچ نہیں رہا۔ یہ ایک خاموش زہر ہے جو انجانے میں پھیلایا جارہا ہے۔ صرف مالی فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہر چیز کے اشتہار کو فحش سے فحش تر بنایا جاتا ہے تا کہ نوجوان نسل کو مائل کیا جاسکے۔

اس سارے معاملے کا ایک پہلو ملکی زرمبادلہ کی بیرون ملک منتقلی بھی ہے۔ اکثر ویب سائٹس غیر ملکی ہیں یا ملکی ویب سائٹس کو بھی خرید لیا گیا ہے۔ اس طرح تمام آمدن ملک سے باہر جارہی ہے۔ پاکستان کی سب سے بڑی آن لائن شاپنگ ویب سائٹ بھی فروخت ہو چکی ہے۔ اس سے ایک تو ملکی کاروباری حضرات اور صنعت کاروں کا نقصان ہورہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آن لائن شاپنگ کو بھی قواعد وضوابط کا پابند بنایا جائے۔ حکومت اس بات کا اہتمام کرے کہ آن لائن خرید وفروخت ملکی روایات اور معاشرے کے لئے مثبت ہوں۔ اگر کچھ چیزوں کی خرید وفروخت اخلاقیات کو متاثر کررہی ہے، کوئی ادارہ اپنی پراڈکٹس فروخت کرنے کے لئے فحش اشتہارات کا سہارا لے رہا ہے، جنسی کھلونے اور ادویات کے ذریعے بے راہ روی کا شکار بنایا جارہا ہے یا کوئی بھی ایسی سرگرمی جو ہماری معاشرتی روایات کے منافی ہو تو اس پر پابندی ہونی چاہیے۔ پی ٹی اے کو ایسے اشتہارات روکنے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔ سوشل میڈیا کو کاروباری مقاصد کے لیے ضرور استعمال کیا جائے لیکن اس سے اخلاقیات کا جنازہ نہ نکالا جائے۔ جن ممالک میں یہ سب ہوا ہے وہاں پر شدید قسم کے مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ تباہی کا شکار ہو کر ہی واپس پلٹا جائے، کچھ فیصلے بروقت بھی کر لینے چاہئیں۔ معاشرے کے تمام طبقات کو چاہیے کہ اس بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔ سوشل میڈیا اب زندگی کا حصہ ہے اس کو مفید بنانے کی ضرورت ہے نہ کہ یہ معاشرتی بگاڑ کا ہتھیار ہو اور نوجوان نسل کی تباہی کا باعث بن جائے۔

عالمِ اسلام مدیر

# مغرب صدر اُردوان سے کیوں خائف ہے؟

## ۲۰۲۳ء میں معاہدہ لوزان کی مدت ختم ہونے کے بعد ترکی اپنا اسلامی کردار کھل کر ادا کر سکے گا

مغرب ترکی کے نومنتخب صدر اُردوان سے کیوں خائف ہے اس کے باوجود کہ وہ اپنے ملک میں نفاذ شریعت کا علم بردار نہیں، وہ کسی دینی جماعت کا سربراہ نہیں اور نہ خود مولوی اور عالم دین ہے؟ اور سارے مسلم ممالک کے دین دار لوگ اس سے کیوں محبت کرتے ہیں اور اس کی (اور اس کی جماعت کی) کامیابی پر کیوں خوش ہیں جب کہ اس کی صورت حال وہ ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا۔

امت کے دین دار مسلمان اس کی کامیابی سے اس لیے خوش ہیں اور مغرب اس لیے اس کی کامیابی سے خائف ہے کیونکہ وہ عالم اسلام کا واحد حکمران ہے جو مغرب کی چالوں اور ان سازشوں کو سمجھتا ہے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ جو دل سے عالم اسلام کے اتحاد کا داعی ہے، جو امت کی نشأۃ ثانیہ اور ترکی کی عظمتِ گم گشتہ کی واپسی کے لیے پُرعزم ہے۔

مغرب مذکورہ باتوں کے علاوہ اس لیے بھی اس کی ناکامی کا خواہاں ہے اور اس کے لیے اس نے کچھ عرصہ پیشتر ایک مغرب پسند دینی جماعت (فتح اللہ گولن کی تحریک) اور فوج کی مدد سے اس کا تختہ الٹنے کی بھی کوشش کی کیونکہ معاہدہ لوزان کی سوسالہ مدت ۲۰۲۳ء میں ختم ہو رہی ہے۔ اس معاہدے کی رو سے جو بہت سی پابندیاں مغربی قوتوں نے اس وقت کی ترکی پر لگائی تھیں، اردوان نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان پابندیوں کے خاتمے کی مدت پر نئی پالیسیاں وضع کرے گا جن میں سے چند نمایاں یہ ہیں: وہ بحر اسود اور بحر متوسط کو ملانے والی آبنائے باسفورس سے گزرنے والے جہازوں پر ٹیکس لگا سکے گا بلکہ ان سمندروں کو ملانے والی نئی نہر نکالے گا جو اس کی قومی آمدنی میں بیش بہا اضافے کا سبب بنے گی۔ وہ پٹرول کے کنویں کھدوا سکے گا نیز وہ بعض ملحقہ علاقوں پر اپنا حق جتا سکے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ترکی آئین کی سیکولر

حیثیت کو ختم کر سکے گا جو ترکی میں نفاذ شریعت کی راہ میں بنیادی رکاوٹ ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ معاہدہ لوزان ہی کی رو سے ترکی نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تھا۔ اگرچہ اردوان نے احیائے خلافت کے لیے کسی منصوبے کا اعلان نہیں کیا لیکن خلافت عثمانیہ کی مدح وثناء اور احیاء کے لیے ترکی میں کام زور وشور سے ہو رہا ہے اور عملاً امت مسلمہ کے لیے اردوان نے وہ کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے جو خلافت عثمانیہ کا تھا جیسے مظلوم فلسطینیوں کی مدد، روہنگیا مسلمانوں کی اعانت، افریقہ کے مظلوم مسلمانوں کی نصرت، مصر وشام میں مظلوم دینی لوگوں کی حمایت، پاکستان کی تائید، OIC کو فعال بنانے کی کوششیں۔ دعا ہے کہ اللہ اردوان کو نظر بد سے بچائے اور اپنوں اور غیروں کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔

---

## بقیہ: عصرِ حاضر میں تزکیۂ نفس

ان مجوزہ نئی تربیت گاہوں کا لائحہ عمل یہ ہونا چاہیے:

۱۔ ترجیحاً یہ آبادی سے باہر کسی کھلی جگہ پر ہوں۔

۲۔ مسجد اس کا ایک حصہ ہو۔

۳۔ وہاں لوگوں کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام ہو۔ اگر منتظمین بلا معاوضہ کھانے کا مالی بوجھ نہ اُٹھا سکیں تو آنے والوں سے اس کے اخراجات لیے جا سکتے ہیں۔ (بلکہ جس طرح آج کل لوگ بیمار ہیں، ہو سکے تو پرہیزی کھانے تیار کرنے کی گنجائش بھی رکھی جائے۔) کھانے اور رہائش کا صاف ستھرا اور متوسط درجے کا یکساں انتظام ہو (لیکن مریضوں اور ضرورت مندوں کے لیے خصوصی انتظام کی گنجائش ہونی چاہیے) تا کہ لوگ ہفتے عشرے کے لیے یہاں آئیں، دین کا علم بھی سیکھیں اور دین پر عمل کرنا بھی سیکھیں۔ تعلیم وتربیت کا باقاعدہ طے کردہ روزانہ کا ٹائم ٹیبل ہو جس پر عمل کیا جائے۔

۴۔ مربی اور مزکی ایسا فرد ہو جو اوپر ذکر کردہ اوصاف کا حامل ہو۔

هذا من عندنا والعلم عند الله.

اسلام اور مغرب مدیر

## افغان جہاد کے خلاف

# اب امریکہ علماء کو استعمال کرے گا

امریکہ افغانستان میں طالبان مجاہدین سے شکست کھانے کے باوجود اپنی رعونت اور غرور کی وجہ سے اور اپنا جعلی دبدبہ قائم رکھنے کے لیے شکست تسلیم کرنے پر تیار نہیں اور اپنے سٹریٹجک مفادات کی خاطر افغانستان سے رخصت ہونے پر بھی تیار نہیں۔ چونکہ وہ طالبان کو شکست نہیں دے سکتا لہٰذا افغان مجاہدین کو اپنے دام فریب میں لانے کے لیے پر امن ذرائع سے جھوٹ، تزویر اور سازش کا ہر ذریعہ استعمال کر رہا ہے۔ ٹرمپ کی ٹیم نے تھوڑا عرصہ پیشتر جو حکمت عملی وضع کی وہ یہ ہے کہ عالم اسلام کے علماء سے افغان جہاد کے خلاف فتوے لیے جائیں کہ یہ جہاد غیر اسلامی ہے اور افغان 'مسلمان حکمرانوں' کے خلاف مسلح مزاحمت ناجائز ہے اور امریکہ کے تھوڑے سے فوجی تو جائز اور منتخب جمہوری حکومت کی مدد کے لیے وہاں ہیں تا کہ وہ امن وامان کی بحالی میں افغان حکومت کی مدد کر سکیں۔

اس غرض سے امریکہ نے پہلے انڈونیشیا میں عالم اسلام کے علماء اور اسلامی سکالرز کی ایک کانفرنس بلوائی جس نے افغان مجاہدین پر زور دیا کہ وہ مزاحمت چھوڑ کر افغانستان میں بحالیٔ امن کے لیے کردار ادا کریں۔ حال ہی میں اس نے دوسری بین الاقوامی کانفرنس سعودی عرب میں منعقد کروائی ہے جس میں سارے مسلم ممالک سے ایک سو سے زیادہ علماء اور اسلامی سکالرز جمع ہوئے اور انہوں نے سعودی حکومت کا تیار کردہ یہ موقف منظور کیا کہ افغانستان کی 'مسلمان حکومت' کے خلاف طالبان کی جدوجہد جہاد نہیں 'دہشت گردی' ہے لہٰذا طالبان کو فساد اور انتہا پسندی ترک کر کے مسلم معاشرے میں امن کی بحالی کے لیے کام کرنا چاہیے اور افغان حکومت سے مفاہمت اور صلح کر لینی چاہیے۔ سعودی عرب نے اس کانفرنس کو OIC کی چھتری بھی مہیا کی اور اس کا نام استعمال کیا اور مکہ مکرمہ میں اس کا انعقاد کر کے اسے ایک گونہ تقدس عطا کرنے کی سعی بھی کی۔

اہل نظر پہلے سے جانتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے کہ سعودی حکمران مغرب کے گماشتہ ہیں اور انہیں اسلام اور عالم اسلام کے مفادات سے زیادہ اپنے اقتدار کا تحفظ اور اس کی طوالت درکار ہے لیکن حال ہی میں سعودی ولی عہد شاہزادہ محمد بن سلمان نے تو لٹیا ہی ڈبودی ہے اور سعودی معاشرے کو مغربی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کے اقدامات اتنی کثرت اور سرعت سے کیے ہیں کہ سارا عالم اسلام اس پر پریشان ہے۔ سعودی عرب مغرب کا غلام تو پہلے بھی تھا لیکن اب مغرب کی فکری غلامی میں تیز روی نے عالم اسلام کے دین دار حلقوں میں تشویش کی زبردست لہر دوڑا دی ہے اور سعودی حکمرانوں کی اس تازہ روش نے حرمین شریفین کے اسلامی مستقبل کو مخدوش بنا دیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سعودی حکمرانوں کو ہدایت دے، وہاں کے علماء کرام اور دین دار عوام کو ہمت دے کہ وہ حکمت وحمیت سے حکمرانوں کے اس رویے کی مزاحمت کریں اور اپنا ایمانی وجود بچانے کی کوشش کریں اور اللہ ان علماء پر اپنا رحم کرے جو دباؤ برداشت نہیں کر پارہے اور 'چلو تم اُدھر کو، ہوا ہو جدھر کی' کے اصول پر عمل کر رہے ہیں۔

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ سعودی عرب یا اس کے زیر اثر OIC یا اسلامی ممالک کے مغرب زدہ منتخب (Selected) علماء اگر طالبان کے امریکہ کے خلاف جہاد کے خلاف فتوی دیں گے تو نہ طالبان پر اس کا کوئی اثر ہوگا اور نہ عالم اسلام کے حریت پسند اور معتدل مزاج علماء کرام پر، کیونکہ سب سمجھتے ہیں کہ یہ امریکی سازش ہے، بلکہ وہ پہلے سے جانتے ہیں کہ امریکی سعودی سازش ہی کی وجہ سے OIC گہری نیند میں ہے، بہت سے مسلم ممالک کی مشترکہ فوج بنائی جارہی ہے جو 'دہشت گردی' کے خلاف لڑے گی اور 'دہشت گرد' کون ہیں؟' اس کی وضاحت بھی اب سامنے آگئی ہے کہ وہ امریکہ سے لڑنے والے مجاہدین ہیں۔ امریکی سازش یہ ہے کہ مسلم ملکوں میں 'دہشت گردوں' کے خلاف اسے نہ لڑنا پڑے، نہ اس کے ڈالر خرچ ہوں اور نہ اس کے فوجی مریں، بلکہ یہ کام اس کے سعودی عرب جیسے ایجنٹ کریں۔ پیسے بھی وہی خرچ کریں اور لڑنے والے بھی مسلمان ملکوں کے فوجی ہوں۔ کیا عیارانہ سازش ہے دشمن کی اور کیا غلامانہ سادہ لوحی بلکہ بے حمیتی اور دیوثیت ہے گماشتہ مسلم حکمرانوں کی!

پاکستان میں بھی اس طرح کی کانفرنس کی اور افغان طالبان کے خلاف علماء سے حصول

فتوی کی زیر زمین کوششیں جارہی ہیں لیکن یہ اتنا آسان بھی نہیں۔ لہٰذا پہلے مرحلے میں اسلامی نظریاتی کونسل میں ایک مغرب زدہ اسلامیات کے پروفیسر کو چیئر مین مقرر کرکے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی میں ایک نااہل کو ڈائریکٹر جنرل بنا کر 'پیغام پاکستان' کے عنوان سے ایک فتویٰ مرتب کرکے کچھ سادہ لوح اور حکومتی علماء کرام سے اس پر دستخط کرالیے گئے ہیں۔ یہ فتویٰ اگرچہ پاکستان کی تاریخ کا ایسا پہلا فتویٰ ہے جس کا مسودہ علماء کی بجائے حکومت پاکستان کے ملازم 'محققین' نے تیار کیا ہے اور وہ کسی مدرسہ کی بجائے صدارتی محل سے جاری ہوا ہے، پھر بھی اس کی استنادی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے کراچی کے ایک بہت بڑے مدرسے کے نامور مفتی صاحب نے کراچی میں ایک کانفرنس منعقد کی اور کراچی بھر کے علماء کو اکٹھا کرکے اس فتوے کے حق میں رائے ہموار کی گئی۔

اس سب کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کے جمہور علماء کرام کی رائے وہ نہیں ہے جو اس فتوے میں ظاہر کی گئی ہے۔ ہم نے البرہان میں 'پیغام پاکستان' کے نام سے حکومت کی طرف سے چھپوائے گئے اس فتوے کی مشکوک شرعی حیثیت پر ایک سے زیادہ بار تبصرہ کیا ہے اور آئندہ کے لیے حکمرانوں اور حکومتی علماء کرام کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ افغان جہاد کے خلاف فتوی دینے کی جسارت نہ کریں کیونکہ امت کے جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ غیر مسلم جارح کی مزاحمت عین اسلامی جہاد ہے اور اگر کوئی غیر مسلم جارح قوت سے کسی مسلمان ملک میں اپنی گماشتہ مسلم حکومت قائم کردے تو اس کی وہ حیثیت نہیں ہوتی جو ایک آزاد مسلم ملک میں آزادانہ طور پر قائم قانونی حکومت کی ہوتی ہے۔

خوش قسمتی سے اس وقت افغان طالبان کی قیادت ایک شیخ الحدیث کررہے ہیں اور انہوں نے دنیا بھر کے علماء سے درخواست کی ہے کہ وہ امریکی سازشوں کے جال میں آنے سے بچیں اور افغان جہاد کے خلاف فتویٰ نہ دیں۔ ہم شیخ الحدیث ھبۃ اللہ کے اس موقف کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔

اسلام اور پاکستان　　پروفیسر ملک محمد حسین

# الیکشن ۲۰۱۸ء - ایک تجزیہ

الیکشن ۲۰۱۸ء میں مذہبی سیاسی جماعتوں کی کارکردگی حسبِ معمول مایوس کن رہی۔ دیگر مین سٹریم سیاسی جماعتوں کے حوالے سے الیکشن کا نتیجہ اس منصوبہ کے عین مطابق ہے جسے مقتدر قوتوں نے تشکیل دیا تھا۔ ہمیں مین سٹریم سیاسی جماعتوں کی انتخابی کارکردگی سے زیادہ سروکار نہیں۔ ہماری خصوصی توجہ مذہبی سیاسی جماعتوں کی انتخابی کارکردگی پر ہے جو اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر نظامِ مصطفیٰ، اسلامی نظام، اسلامی انقلاب اور ناموس مصطفیٰ کے بلند بانگ نعروں کے ساتھ میدان میں آتی ہیں اور اپنے خودغرضانہ محدود مسلکی فیصلوں سے اللہ کے عظیم دین، دینِ اسلام کو بے وقار کر کے حجروں میں مقیم ہو جاتی ہیں۔

اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو عجیب منظر سامنے آتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے پہلے شوکتِ اسلام کے جلوسوں کی شوکت کسے یاد نہیں۔ ایک ہمہ گیر تحریک تھی جو اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ نظر آ رہی تھی لیکن پھر ۱۹۷۰ء کا الیکشن ہوا اور سب کچھ بہا کر لے گیا حتیٰ کہ اس کے نتیجے میں اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت دولخت ہو گئی۔ اگرچہ اندرا گاندھی نے اس وقت بیان داغا تھا کہ ہم نے دوقومی نظریہ بحر ہند میں ڈبو دیا ہے لیکن یہ دوقومی نظریے کی ناکامی نہیں تھی، یہ دوقومی نظریہ کی حامل قوتوں کی ناکامی تھی جو آپس میں مسلکی سر پھٹول اور سیاست پر مبنی فرقہ وارانہ طعن وتشنیع کا شکار ہو کر پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی راہ ہموار کر رہی تھیں۔ بنگلہ دیش تو بنا لیکن وہ اسلامی بنگلہ دیش ہی رہا اور نہ تو مغربی بنگال میں ضم ہوا اور نہ ہی بھارت کا حصہ بنا۔ بعد میں ہونے والے الیکشن میں بھی مذہبی سیاسی جماعتیں کوئی قابل ذکر کارکردگی نہ دکھا سکیں سوائے ۲۰۰۲ء کے الیکشن کے، جب متحدہ مجلس عمل تشکیل پائی اور مذہبی جماعتوں کے اس اتحاد نے پورے ملک میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی جب کہ صوبہ خیبر پختون خواہ میں صوبائی حکومت کا اقتدار بھی حاصل کیا۔ صوبہ پختون خواہ میں اپنی پانچ سالہ حکومت میں ایم ایم اے اگر کوئی نظر آنے والی کارکردگی دکھاتی اور اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اس صوبہ کے انتظام وانصرام، تعلیم اور سماجی بہبود میں کوئی بہتری نظر آتی نیز ایم ایم اے

میں شامل مذہبی جماعتیں صبر وتحمل کے ساتھ اکٹھی رہتیں تو یقیناً مستقبل میں اسلامی سیاسی جماعتوں کا سکہ چل جاتا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا کچھ نہ ہوسکا۔ وہی محدود حزبی مفادات آڑے آئے اور دال پیچ چورا ہے کے بٹی۔ اب اس دفعہ پھر بے دلی کے ساتھ ایم ایم اے کا اتحاد عمل میں آتو گیا لیکن اس دفعہ مذہبی سیاست میں نئے عوامل بھی شامل ہوگئے ہیں۔ تحریک لبیک پاکستان بریلوی گروپ کے سوادِ اعظم کی نمائندگی کا دعویٰ لے کر اور ختم نبوت کے حساس مسئلہ کو اپنا منشور بنا کر میدان میں اُتری ہے۔ اسی طرح حافظ محمد سعید صاحب بھی ملی مسلم لیگ کے نام کے ساتھ اور تحریک اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ اسلام اور آزادی کشمیر کا نعرہ لے کر سیاست میں کود پڑے ہیں۔ مولانا سمیع الحق کے ساتھ ساتھ کئی اور چھوٹے بڑے مذہبی گروہ بھی سیاست میں وارد ہوئے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر مذہبی سیاسی محاذ کافی کنفیوژن کا شکار رہا۔ ادھر پی ٹی آئی بھی کئی لحاظ سے اپنے چہرے پر مذہبی سرخی پاؤڈر سجانے کی کوشش کررہی تھی۔

کل ۲۵ء جولائی کو قومی انتخابات ہوئے اور آج ۲۶ جولائی کو یہ سطور لکھی جارہی ہیں تو الیکشن کے نتائج کافی حد تک واضح ہو چکے ہیں۔ پی ٹی آئی میدان مارتی نظر آتی ہے تو مسلم لیگ (ن) مار کھا گئی ہے لیکن پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنی سیاسی طاقت میں اضافہ کیا ہے۔ کئی بڑے بُرج الٹے ہیں تو کئی گمنام سیاسی ورکر اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ زہریلا پروپیگنڈہ، میڈیا کی یلغار اور پیسے نے اپنا جلوہ کامیابی سے دکھایا ہے۔ فیصلہ سازوں نے جو فیصلے کیے تھے وہ کامیابی سے ہم کنار ہوتے نظر آتے ہیں۔ خلانوردوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں، نیا پاکستان بنے نہ بنے 'اُن' کا پاکستان بنتا نظر آرہا ہے۔ ادھر مذہبی سیاسی قوتیں مکمل شکست سے دوچار ہوچکی ہیں۔ ایم ایم اے کوئی جلوہ نہیں دکھاسکی بلکہ دونوں بڑے قائدین یعنی محترم سراج الحق اور مولانا فضل الرحمن شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ لاہور اور کراچی والے حسب سابق ناکامی کا ہار پہنے کھڑے ہیں۔ تحریک لبیک پاکستان کی لبیک کو قبول نہیں کیا گیا اور تحریک اللہ اکبر بھی بس نعرے تک محدود رہی۔ اس طرح تمام اسلامسٹوں کی مساعی سے اسلام ان اسلامسٹوں کے ہاتھوں بے وقار ہوا۔

کاش ہمارے مذہبی سیاسی لیڈر معاشرے کی درست تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دیتے،

قرآن وسنت کی روشنی میں انسان سازی کرتے تو معاشرے میں بھلائی پھیلتی اور اس طرح سیاست میں بھی خیر کا بول بالا ہوتا۔ ہمارے مذہبی سیاسی رہنماؤں کو سیاست کی چاٹ ایسی لگی ہے کہ وہ اپنا اصل فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف بلانے کی دعوت کا کام بھول گئے ہیں۔

ہمارے مذہبی سیاسی رہنماؤں نے البتہ ایک محاذ پر کامیابی حاصل کی ہے وہ یہ کہ فیصلہ سازوں نے جو فیصلے کیے تھے، ان فیصلوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنا دستِ تعاون پیش کیا ہے۔ پی ٹی آئی کی کامیابی اور ن لیگ کی ناکامی میں اس دستِ تعاون کا بڑا رول ہے۔ ملک کا جو کٹر مذہبی ووٹ ہے اگر اُسے مذہبی سیاسی پلیٹ فارم نہ ملے تو وہ طوعاً کرہاً اپنی رائے مسلم لیگ کے حق میں دیتا ہے، چاہے اس مسلم لیگ کا لاحقہ کچھ بھی ہو۔

یہ ہمارا الیکشن ۲۰۱۸ء پر فوری ردِعمل ہے۔ ان شاء اللہ تفصیلی تجزیہ البرہان کے آئندہ شمارے میں پیش کیا جائے گا۔

## شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 500 روپے تاحیات 6000 روپے

نام..........................................

پتہ..........................................

..........................................فون..........................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

مکالمہ

مدیر

# اہم دینی موضوعات پر قارئین سے تبادلۂ خیال

[اس کالم میں ہم اپنے قارئین کے تبصروں اور اٹھائے گئے سوالات کے مختصر جواب دیا کریں گے۔ اس شمارے میں پروفیسر رشید احمد انگوی (لاہور)، ڈاکٹر انعام اللہ (اٹک) اور انجینئر محمد اکرم سوری (لاہور) کے خطوط اور ای میل پر مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔ مدیر]

## نیا نظام تعلیم کون قائم کرے گا؟

لاہور سے پروفیسر رشید احمد انگوی کہتے ہیں کہ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب نے نئے نظام تعلیم کی بات کر کے عظمت فکری کا ثبوت دیا ہے، دینی مدارس کی بہت زیادہ خدمات ہیں لہٰذا ایک دوسرے کو الزام دینے کی بجائے سب کو نئے نظام تعلیم کے قیام کے لیے کام کرنا چاہیے۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ ہم تو مفتی صاحب کی تائید کرتے ہیں۔ بات الزام تراشی کی نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ نیا نظام تعلیم کون قائم کرئے گا؟ ہمارا کہنا یہ تھا اور ہے کہ دینی مدارس خصوصاً ہمارے قابل احترام مفتی صاحب اور ان کا ادارہ یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ اور دینی سیاسی جماعتیں اور اصلاحی ودعوتی تحریکیں یہ کام کیوں نہیں کرتیں؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر علماء یہ کام نہ کریں، حکومت بھی یہ کام نہ کرے، تو پھر کون کرے گا؟ جدید تعلیم والوں کو تو اس کا احساس ہی نہیں۔ پچھلے ۳۰ سال سے ہم یہ کام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کہیں سے ہمیں تائید وحمایت نہیں ملی۔ اگر دینی مدارس ہماری فکری حمایت اور عملی مدد کریں تو ہم اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے تیار ہیں۔

## کیا پاکستان 'اسلامی' ریاست ہے؟

لاہور سے انجینئر محمد اکرم سوری صاحب نے ہمیں ایک طویل خط لکھا ہے اور 'پیغام پاکستان' والے فتوے پر تائیدی دستخط کرنے والے علماء کرام کو بھی طویل خطوط بھیجے ہیں جن

میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ پاکستان کی ریاست ’اسلامی‘ نہیں ہے۔ (اس میں انہیں بریگیڈیئر (ر) محمد حنیف صاحب کی کمک بھی حاصل ہے)۔ اس کے لیے وہ یہ دلائل دیتے ہیں کہ قرارداد مقاصد کی عبارات مبہم ہیں، سیاستدانوں نے اسے کبھی آئین کے قابل نفاذ (Operatonal) حصہ میں شامل نہیں کیا اور اعلیٰ عدلیہ نے اسے آئین کی دوسری شقوں پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اس کے علاوہ آئین میں کئی خلاف اسلامی چیزیں بھی موجود ہیں جیسے سربراہ مملکت کا عدالتوں کی طرف سے ثابت شدہ مجرموں کی سزا معاف کرنا۔ مزید یہ کہ آئین اور قوانین میں جو اسلامی دفعات ہیں، ریاست کے ادارے ان پر عمل درآمد نہیں کرتے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ محمد اکرم سوری صاحب کی باتوں میں وزن ہے اور آئین وقوانین کے اسلامی حوالے سے ناقص ہونے اور متعلقہ اسلامی دفعات پر ریاستی اداروں کے عمل درآمد نہ کرنے والی بات بھی صحیح ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان کے اس موقف کو تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان ایک ’اسلامی‘ ریاست نہیں ہے۔

درحقیقت یہ ایک بہت نازک اور حساس مسئلہ ہے۔ اسلامی قانون (فقہ واصول فقہ) کے ماہر علماء اور دستوری قانون (Constitutional Law) کے ماہرین اس کی باریکیوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں، تاہم ایک عام پڑھا لکھا دین دار شخص بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک شخص کلمہ nF'?m/ VŹǫý nF'rF" nØF پڑھتا ہے تو وہ ’مسلمان‘ ہو جاتا ہے۔ اس کی بے عملی اور اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنا اگرچہ غلط اور بری بات ہے لیکن ان بد اعمالیوں کی وجہ سے ہم اسے ’غیر مسلم‘ نہیں کہتے اور جمہور اہل سنت کی رائے کے مطابق اس کے ایمان کی نفی نہیں کر سکتے۔ یہی حال ریاست کا ہے کہ جب وہ یہ تسلیم کرتی ہے اور اس کا باقاعدہ تحریری اعلان کرتی ہے کہ وہ ’اسلامی‘ ہے تو اب ہم اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اور اعلان اسلام میں بعض جزوی نقائص کی وجہ سے اسے ’غیر اسلامی‘ قرار نہیں دے سکتے۔

ہم نے اسے نازک اور حساس مسئلہ اس لیے قرار دیا تھا کہ اگر ہم پاکستان کو ’غیر اسلامی‘ ریاست قرار دیتے ہیں تو اس کے نتائج خوفناک نکلتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے پھر ہم پر اس کی اطاعت واجب نہیں رہتی اور اس کے خلاف ہتھیار اٹھانا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے

اس سے ریاست کے وجود کی نفی ہوتی ہے اور وہ چل ہی نہیں سکتی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ریاست اپنے وجود کے تحفظ کے لیے اس بات کو تسلیم نہیں کرے گی بلکہ اسے 'بغاوت' قرار دے کر کچل دے گی۔ یہ صورتِ حال ہمارے معاشرے اور امت کے لیے تباہ کن ہے لہٰذا ہم اس صورتِ حال سے بچنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ریاست کے 'اسلام' کو دستوری طور پر قبول کر لیا جائے اور پھر اسے عملاً اچھا مسلمان بنانے کے لیے جدوجہد کی جائے جس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔

## کافر اور منافق معاشرے میں سے قابل ترجیح کون؟

اٹک سے ڈاکٹر انعام اللہ صاحب اپنی ای میل میں کہتے ہیں کہ 'منافق' معاشرے کی بجائے 'کافر' معاشرے میں رہنا بہتر ہے کہ مقابلے کی فضا میں وہاں 'اسلامی تشخص' تو برقرار رہتا ہے۔

نہیں بھائی! آپ کی رائے صحیح نہیں ہے۔ کافر معاشرے میں جو لوگ جا کر رہتے ہیں مشاہدہ یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت (ایک اندازے کے مطابق ۹۵ فیصد) بتدریج اس کافر معاشرے میں ضم ہو جاتی ہے اور صرف ۵ فیصد لوگ اپنے اسلامی تشخص کو بچانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور اہل سنت کے علماء کرام کافر معاشرے میں جا کر مستقل رہنے کی حمایت نہیں کرتے اور صرف عارضی طور پر سفارت، تجارت وغیرہ کے لیے جانے کی اجازت دیتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں 'منافق' معاشرے میں رہنا زیادہ اہم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر متقی اور نیک مسلمان 'منافق' معاشرے سے اس لیے ہجرت کر جائیں کہ وہ منافق ہے تو اس نفاق کو دور کون کرے گا؟ ان منافق مسلمانوں کو اچھا مسلمان کون بنائے گا؟ اسی میں تو مخلص اور متقی مسلمانوں کا امتحان ہے۔ نیز قرآن وسنت نے مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم اسی لیے دیا ہے کہ معاشرے کی اصلاح ہوتی رہے۔ اگر نیک اور باعمل مسلمان صرف اپنے متقی ہونے کو کافی نہ سمجھیں بلکہ دوسروں کو متقی بنانے کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھیں تو پھر ہی معاشرے

کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر (دعوت واصلاح، تبلیغ، تزکیہ، تعلیم وتربیت وغیر اسی کے مختلف شیڈز [Shades]اور ذرائع ہیں) کا ادارہ صحیح خطوط پراور موثر انداز میں کام نہیں کررہا۔حکومتیں اورریاستی ادارے مغرب زدہ ہیں اوراس کام کی حیثیت وضرورت ہی کونہیں سمجھتے۔صوفیاءسجادہ نشینی کے ذریعے نوٹوں اور ووٹوں کے چکر میں ہیں۔دینی سیاسی جماعتیں صرف اسلامی نظام بذریعہ سیاسی جدوجہد کی قائل ہیں۔ دینی مدارس کے علماءفرقہ واریت کی سرپرستی کرتے اورصدیوں پرانے متون طلبہ کورٹوانے اور عصرحاضر کی ضرورتوں سے چشم پوشی کرنے میں مصروف ہیں۔یہی حال مساجد کا ہے۔’تبلیغی جماعت‘ والے لوگوں کے کلمے سیدھے کرانے میں مصروف ہیں اور’دعوت اسلامی‘ والے بھائی ایک معمولی کام کے کروڑوں ثواب والی میٹھی میٹھی حضور(علیہ الصلاۃ والسلام) کی سنتیں پڑھنے پڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔خلاصہ یہ کہ اس معاشرے میں صحیح خطوط پرافراد کے تزکیہ نفس، تعمیر سیرت اور انسان سازی کا کام کرنے والا کوئی گروہ ہے ہی نہیں تو تبدیلی کہاں سے آئے؟....اور دوسری طرف مغرب کی الحادی اور مادہ پرست تہذیب کے غلبے کا فتنہ ہے جو سیلاب کی طرح ہمارے اقداراوراصولوں کو بہائے لیے جارہاہےاورمسلمانوں میں اس کا علمی ،فکری، تہذیبی اورحربی مقابلہ کرنے والا اوران کا منہ موڑنے والا کوئی ہے ہی نہیں تو معاشرہ منافق نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

ڈاکٹر انعام اللہ صاحب! اس مسئلے کا حل یہ نہیں کہ منافق معاشرے کواس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور یہاں سے عالم کفر کو ہجرت کرلی جائے بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ یہاں رہ کر محنت کی جائے کہ ان منافقوں کو نیک، متقی اور مخلص مسلمان بنایا جائے۔ یہ ہے کرنے کا اصل کام جو مجھے،آپ کو،حکومتوں کو، علماءکو،صوفیاءکو،سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کو، دینی مدارس ومساجد کو....غرض سب کوکرنا چاہیے کہ اسی میں ہماری دنیاوآخرت کی کامیابی ہے۔